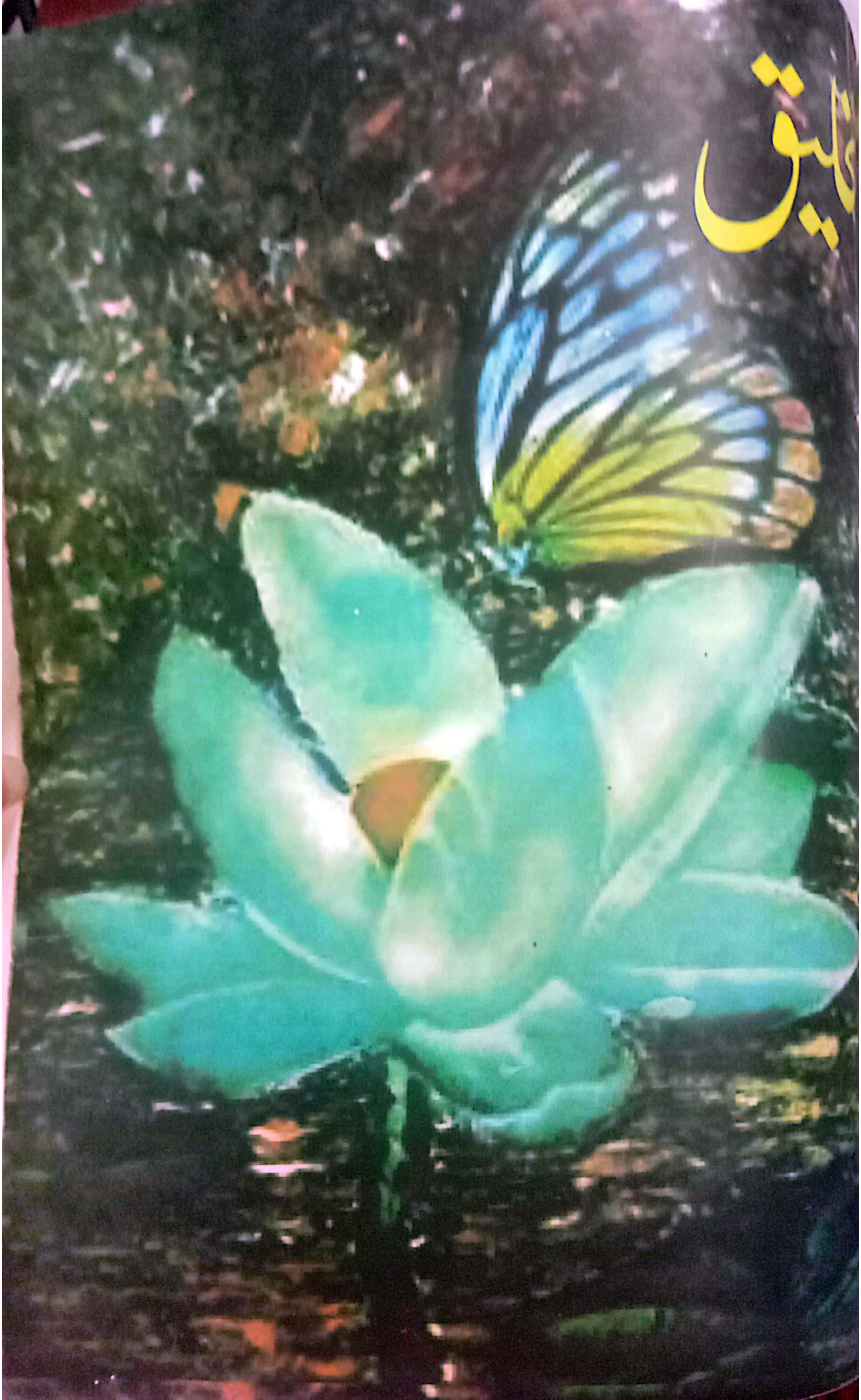

ماہنامہ تخلیق لاہور

بانی مدیر اظہر جاوید

1969-2012ء

مدیر سونان اظہر جاوید

جلد : 43	ستمبر 2012ء	شمارہ : 9

قیمت فی پرچہ : 100روپے ..... سالانہ : 500روپے

E-67.A-1, St # 3, Near Defence Chowk, Police Chowki,
Super Town, Lahore-Cantt.

فون نمبرز: 04236620499۔04236671007.....موبائیل فون:03218899007
ای میل:ajavedtakhleeq@yahoo.com.....ajavedtakhleeq@gmail.com

ماہنامہ ''تخلیق'' کے مدیر جناب اظہر جاوید نے عہد کیا تھا کہ وہ ''تخلیق'' کو اپنی زندگی کے آخر سانس تک جاری رکھیں گے۔ انہوں نے اس عہد کو پورا کیا اور 14 رفروری 2012ء کو اپنی جان...... جانِ آفرین کے سپرد کی تو اس ماہ کا ''تخلیق'' شائع کر چکے تھے اور یہ ادبی رسالہ اپنی اشاعت کے 43 ویں سال میں قدم رکھ چکا تھا۔

جناب اظہر جاوید کی وفات کے بعد ''تخلیق'' کی ترتیب و تدوین اور طباعت و اشاعت کی ذمہ داری میرے کندھوں پر آ پڑی۔ ادبی صحافت کے میدان میں نو وارد ہونے کے باوجود...... میں نے اپنے والد مرحوم کی اس وراثت کو قائم رکھنے کا عہد کیا ہے اور سب سے پہلے ان کی یاد میں ''اظہر جاوید نمبر'' پیش کیا جسے ادبی حلقوں میں پسند کیا گیا۔ دم ہے تو ''تخلیق'' پیہم رہے گا اور یہ ''علامت''، ''افکار''، ''صریر''، ''تقاضے'' اور ''طلوعِ افکار'' جیسے رسائل کی صف میں شامل نہیں ہوگا۔ (انشا اللہ) جو مدیرِ اعلیٰ کی وفات کے ساتھ ہی مرحوم ہو گئے۔

43 سال تک ''تخلیق'' کی اشاعت رفیقانِ تخلیق کے تعاون کی مرہونِ منت ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ یہ تعاون اب مجھے بھی حاصل رہے گا۔ ''تخلیق'' کے نئے دور میں چند اہلِ ادب نے دل کھول کر ''تخلیق'' کی معاونت کی اور آئندہ بھی مدد کا وعدہ کیا ہے۔ یہ اہلِ دل شاد آباد رہیں۔ ان اہلِ دل کے مشورے سے ''تخلیق'' کی باقاعدہ اشاعت کے لئے ''تخلیق فاؤنڈیشن'' قائم کی جا رہی ہے اور چند ناگزیر وجوہات کی وجہ سے دفتر ''تخلیق'' کی تبدیلی اور پرچے کی قیمت میں معمولی اضافہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اُمید ہے آپ اسے خوشی سے قبول کریں گے۔

امریکہ، یورپ اور ہندوستان میں ''تخلیق'' کے امور کی ذمہ داری محترمہ نیّر جہاں، تاشی ظہیر اور نارنگ ساقی نے حسبِ سابق قبول کر لی ہے۔ یورپ اور امریکہ کے لئے زرِ تعاون پچاس (75) ڈالر (یا اس کے مساوی کرنسی)، ہندوستان کے لئے زرِ سالانہ صرف 1,000 روپے ہے۔

☆ تخلیق کا نیا پتہ: **E-67.A-1, St # 3, Near Defence Chowk, Police Chowki, Super Town, Lahore-Cantt**

PAKISTAN	**INDIA**	**U.S.A.**	**U.S.A.**
Soonan Azhar E/13/13C-1, Bismilla Lane, Cavalary Ground, Officer Colony, St.No.7 Walton Lahore-Cantt. Ph: 04236671007 Cell : 0321-8899007 Email:ajavedtakhleeq@gmail.com Email:ajavedtakhleeq@yahoo.com	K.L. Narang Saqi L-4-Connaught Circus, New Delhi-110001, India Ph: 0091-41517818 Email:narangsaqi@gmail.com	Naiyar Jahan 721-Hill Street 111-Santa Monica C.A. 90405, U.S.A. Ph : 0013103969303 Email:Zihanat@hotmail.com urdu@urdu markaz.com	Tashie Zaheer 591-Sylvanave Mountain View C.A.94041 U.S.A. Ph: 0015107503297 Email: tzaheer@gmail.com

ترتیب

پہلی بات — سونان اظہر جاوید — 5

مضامین

اسلوب کی تفہیم — غلام شبیر رانا — 9
ناول کا فن اور نقاد — انور سدید — 15
قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری — راشد محمود چدھڑ — 20

نظمیں

رہائی — شاہین — 24
تم سے کچھ نہیں کہنا — ثمینہ سیّد — 24
نظمیں — علیم صبا نویدی — 25
ترسیل کا المیہ — علی عباس اُمید — 26
برف کی ریت — فوقیہ مشتاق — 26

افسانے

بٹی ہوئی فصل — نجم الحسن رضوی — 27
چھلاوہ — عطیہ سیّد — 33
پڑاؤ — بشریٰ اعجاز — 41
لال قلعہ — سرور سکھیرا — 51
بددُعائیں — یٰسین احمد — 57

غزلیں

سعید احمد اختر، حسن عسکری کاظمی، بسمل صابری، وصی شاہ، ظفر علی راجا، شاہ محمد سبطین شاہجہانی، سلیمان خمار، کرامت بخاری، رفیع الدین ذکی، صفدر صدیق رضی، عمر زمان، زمان کنجاہی، نسیم سحر، انوار فیروز، وصی مکرانی واجدی، ثمینہ سیّد، حیات رضوی امروہوی، آفتاب خان، فرزانہ جاناں، عظیم راہی، عبدالجبار اثر — 62 — 72

یادنگاری

کرنل مجید ملک — شفیع عقیل — 73

آپ بیتی

میری کہانی — فرخندہ لودھی — 78
نکلے ہوئے جنت سے — عزیز میرٹھی — 83
سفرِ شمال — طارق محمود — 88
بیتے کل کا اِک اِک پل — نذیر فتح پوری — 92

طنز و مزاح

رحم عالی جاہ رحم — ایس ایم مبین قریشی — 95

گوشۂ اظہر جاوید

اظہر جاوید سے پہلی ملاقات	شہزاد احمد	101
پیادیکھن کی آس.....		
اظہر جاوید کے لیے	ابدال بیلا	103
مدھوبن کا گردھر.....اظہر جاوید	بابا محمد یحییٰ خان	118
دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد		
خراب میں	مظفر حسن منصور	121
کچھ اظہر جاوید کے بارے میں	ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش	124
تلقین (نظم)	اظہر جاوید	127
اہلِ تخلیق تجھے یاد کریں گے		
صدیوں	اخلاق عاطف	128

''تخلیق اظہر جاوید نمبر'' پر ایک نظر

انور سدید۔شاہد بخاری۔انوار فیروز علی سفیان آفاقی۔قیصر نجفی		129

پنجاب رنگ

حضرت سچل سرمست	لطیف قریشی	140
گونج	مُنزہ شاہد	140

سوالنامے کے جوابات

انور سدید۔سرفراز سیّد		141
انجمنِ خیال (خطوط)		148

ناشر

سونان اظہر جاوید 0321-8899007

طابع

بیدار سرمدی

مطبع

بُکسن پرنٹرز، گلشن راوی، لاہور

مقامِ اشاعت

E-67.A-1, St # 3, Near Defence Chowk,
Police Chowki, Super Town, Lahore-Cantt

پہلی بات

والدِ محترم اظہر جاوید مدیر ''تخلیق'' کی اچانک موت میرے لئے ایک سانحۂ عظیم تھا جس نے مجھے روحانی طور پر شدید صدمے سے دوچار کر دیا۔ کرب کی اس کیفیّت میں جب ادبی حلقوں سے یہ آوازیں اٹھیں کہ ماہنامہ ''افکار''، ''صریر''، 'طلوعِ افکار''، ''فنون'' اور ''اوراق'' کی طرح اب ''تخلیق'' کی اشاعتی زندگی بھی ختم ہو جائے گی، تو مجھے احساس ہوا کہ ''تخلیق'' کی اشاعت کو قائم رکھنا ضروری ہے کیونکہ یہ والدِ محترم کی زندگی کا حصہ بن چکا تھا۔ میں اظہر جاوید کے دوستوں کا شکر گزار ہوں کہ ان کے تعاون سے ''تخلیق'' کا جون 2012ء کا شمارہ ''اظہر جاوید نمبر'' کی صورت میں شائع ہوا۔ یہ شمارہ 360 صفحات پر مشتمل ہے اور ''تخلیق'' کے معاونین نے اس کی پذیرائی وسیع پیمانے پر غیر معمولی انداز میں کی۔ میں نے ''اظہر جاوید نمبر'' میں گزارش کی تھی کہ ''تخلیق'' اب اظہر جاوید کی یادگار کے طور پر حسبِ سابق باقاعدگی سے شائع ہوگا۔ زیرِ نظر شمارہ اس ارادے کی طرف پیش قدمی کی مثال ہے اور اس کی اشاعت میں آپ سب شامل ہیں۔

یہاں اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ ''تخلیق'' کے کرم فرماؤں نے اظہر جاوید صاحب کے لئے اپنے خلوص اور محبت کا اظہار دل کی گہرائیوں سے کیا اور مضامین نظم و نثر اتنی بڑی تعداد میں عنایت فرمائے کہ ان سب کو ایک ضخیم اشاعت میں سمیٹنا ممکن نہ رہا۔ مضامین کی آمد کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ اس صورتِ حال سے نمٹنے کے لئے ''تخلیق'' کی ہر اشاعت میں گوشۂ اظہر جاوید پیش کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ 2012ء کو پہلے ہی ''سالِ اظہر جاوید'' قرار دیا جا چکا ہے۔ کچھ کرم فرماؤں نے اپنے مضامین کی عدم اشاعت پر ناراضی کا اظہار کیا۔ مجھے اظہر جاوید سے ان کی محبت اور خلوص کا احساس ہے۔ میں انھیں یقین دلاتا ہوں کہ ان کے مضامین ''تخلیق'' میں ضرور شائع ہوں گے اور اظہر جاوید کو یاد رکھنے کا سلسلہ جاری رہے گا۔ (انشا اللہ) تاخیرِ اشاعت کے لئے میں ان کرم فرماؤں سے معذرت خواہ ہوں۔ مجھے ادبی ادارت کا تجربہ نہیں تھا۔ سچ یہ ہے کہ والدِ محترم نے مجھے زندگی میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے اور خودداری سے حالات سے نبرد آزما ہونے کا سبق تو دیا لیکن ادبی رسالے کی ادارت کی تربیت سے محروم رکھا۔ میں اُن دوستوں کا شکر گزار ہوں جنھوں نے ''اظہر جاوید نمبر'' کی ترتیب و تدوین میں میری راہنمائی کی۔ ان کا تعاون مجھے اب بھی حاصل ہے اور میں ہمیشہ اس سے استفادہ کرتا رہوں گا۔ اس حقیقت سے سب آشنا ہیں کہ الیکٹرانک میڈیا کے فروغ نے ادبی رسائل کو شدید ترین نقصان پہنچایا ہے اور اب ادب تخلیق کرنے والے ہی ادب کے قارئین ہیں۔ اس زاویے سے میں ''تخلیق'' کے قلمی معاونین کو یہ مژدہ سناتے ہوئے خوشی محسوس کر رہا ہوں کہ وہ سب ''تخلیق'' کی ترتیب و تدوین اور پیشکش میں عملی

طور پر شامل ہیں۔ آپ اس کے انتظامی، فنّی اور مالی امور میں معاون ہیں اور میں اُمید کرتا ہوں کہ آپ اس کے حلقۂ اشاعت کو وسعت دینے کی کوشش جاری رکھیں گے۔ اس سلسلے میں کچھ دوستوں نے ''تخلیق'' کی سالانہ خریداری کی مہم میں عملی شرکت شروع کر دی ہے اور وہ ادبا بھی جو اظہر جاوید صاحب سے بلا قیمت پرچہ حاصل کرتے تھے اب اس کے خریدار بن رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ''تخلیق'' کے قلمی معاونین اسے مالی اعتبار سے خود کفیل بنانے میں معاونت کریں گے اور ''تخلیق'' کو مالی دشواریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔

اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ تجارتی ادارے ادبی رسائل کو اشتہار دینے سے گریز کرتے ہیں، حالاں کہ ٹی وی کے اشتہار کا عرصہ چند لمحات اور روزانہ اخبار کا ایک دن ہوتا ہے جبکہ ادبی رسالہ کا اشتہار مہینوں پڑھنے والوں کی نظر میں رہتا ہے اور .....مصنوعات کی طرف متوجہ کراتا ہے۔ گویا ادبی رسالہ مصنوعات کی تشہیر کا بہترین ذریعہ ہے، جس سے کچھ ادارے استفادہ کر رہے ہیں۔ ہم بڑے صنعتی اداروں سے اشتہارات کے وسیلے سے تعاون کی درخواست کرتے ہیں۔

جناب اظہر جاوید اپنی زندگی میں نئی کتابوں اور رسائل کے اشتہارات اعزازی طور پر شائع کرتے رہے ہیں۔ ہماری آرزو بھی ہے کہ یہ روایت قائم رہے تاہم بعض کرم فرماؤں نے مشورہ دیا کہ ہوش ربا گرانی کے اس دور میں کتابوں کے اشتہارات رعایتی نرخ پہ شائع کیے جائیں۔ ہم یہ تجویز ''تخلیق'' کی اشاعت کو جاری رکھنے کے لئے آپ کی خدمت میں پیش کرتے ہیں اور اشاعتی اداروں کی توجہ بالخصوص اس طرف مبذول کراتے ہیں۔ ''تخلیق'' اظہر جاوید مرحوم کی یادگار ہے۔ اس کی اشاعت میں معاونت ادبی عبادت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس معاونت سے آپ روحانی خوشی محسوس کریں گے اور ادب کا کارواں آگے بڑھتا رہے گا۔ آیئے اپنا اپنا ادبی فرض ادا کریں۔ میں اللہ کی مہربانی سے اپنے اور آپ کے ارادوں کی کامیابی کی دعا کرتا ہوں اور آخر میں ایک بے حد ضروری بات۔

درخواست ھے کہ

- **الفاظ کی دولت کفایت سے استعمال کیجئے، اختصار سے لکھیے۔**
- **''تخلیق'' کو طویل مضامین بھیج کر امتحان میں نہ ڈالیے۔**
- **اس پرچے پر اپنی گراں قدر رائے لکھیئے۔ ''انجمنِ خیال'' آپ کی منتظر ہے۔**

جناب کیول دھیر کی لاہور آمد

بھارت کے ممتاز افسانہ نگار جناب کیول دھیر گزشتہ دنوں اظہر جاوید مدیر ''تخلیق'' کی وفات پر اظہارِ افسوس کرنے کے لیے لاہور تشریف لائے۔ دفتر ''تخلیق'' میں ان کا استقبال ڈاکٹر افضال بیلا، ڈاکٹر انور سدید، محترمہ بشریٰ اعجاز، محترمہ سیما پیروز، جناب پیروز بخت قاضی اور راقم سونان اظہر جاوید نے کیا۔ جناب کیول دھیر بہت دیر تک اظہر جاوید سے اپنی ملاقاتوں اور یادوں

کی تجدید کرتے رہے۔ انہوں نے اظہر جاوید کو پاکستان اور ہندوستان دونوں ملکوں میں اردو ادب کو فروغ دینے والا بے لوث انسان قرار دیا۔ جناب کیول دھیر کی آمد پر لاہور میں کئی ادبی تقریبات منعقد ہوئی اور انہوں نے ہر محفل میں اظہر جاوید کی وفات کا ذکر عقیدت اور محبت سے کیا۔ ادارہ ''تخلیق'' جناب کیول دھیر کے جذبات کا قدر دان ہے اور اس قدر لمبے سفر کی زحمت اُٹھانے پر ان کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

وفیات

گزشتہ چند ماہ کے دوران اردو کے ممتاز دانشور علامہ غلام شبیر بخاری، شاعر و نقاد آفاق صدیقی، دانشور عبیداللہ بیگ، شاعر و دانشور اعجاز فاروقی اور نعت گو بشیر حسین ناظم وفات پا گئے۔ پروفیسر شبیہ الحسن کو کسی شقی القلب نے گولی مار کر قتل کر دیا۔ یکم اگست 2012ء کو اردو کے ممتاز شاعر، دانشور، مجلسِ ترقی ادب کے ناظم، رسالہ ''مخزن'' کے مدیر اور اظہر جاوید کے قریبی دوست شہزاد احمد وفات پا گئے۔ انہوں نے اظہر جاوید سے اپنی پہلی ملاقات کا حال ایک مضمون کی صورت میں لکھا تھا۔ ان کی یہ آخری تحریر زیرِ نظر پرچے میں شامل ہے۔ ادارہ ''تخلیق'' ان سرکردہ ادبی شخصیات کی وفات پر گہرے دُکھ اور غم کا اظہار کرتا ہے۔ حق تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین!

رب راکھا

سونان اظہر جاوید

◆◆◆

صلائے عام

بانی مدیر ''تخلیق'' جناب اظہر جاوید کی روایت کو برقرار رکھتے ہوئے ادارہ ''تخلیق'' نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کا سلسلہ جاری رکھے گا۔ ہم انہیں دعوت دیتے ہیں کہ ہمیں اپنے مضامین، افسانے اور شاعری کمپیوٹر کتابت میں ارسال کریں۔ صرف معیاری تحریروں کو اشاعت کے لیے منتخب کیا جائے گا اور سال کے بہترین نو آموز لکھاری کو ادارہ ''تخلیق'' کی جانب سے ایک سال تک ''تخلیق'' اعزازی طور پر جاری کیا جائے گا۔

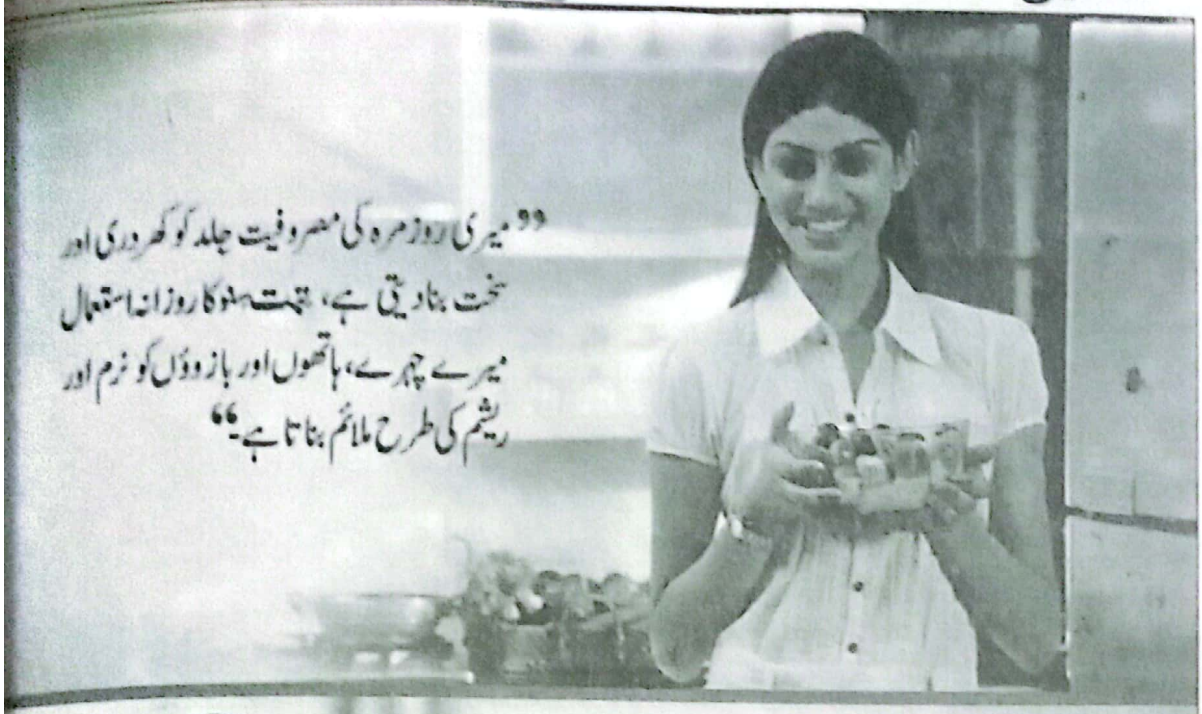

"میری روزمرہ کی مصروفیت جلد کو کھردری اور سخت بنا دیتی ہے، تبت سنو کا روزانہ استعمال میرے چہرے، ہاتھوں اور بازوؤں کو نرم اور ریشم کی طرح ملائم بناتا ہے۔"

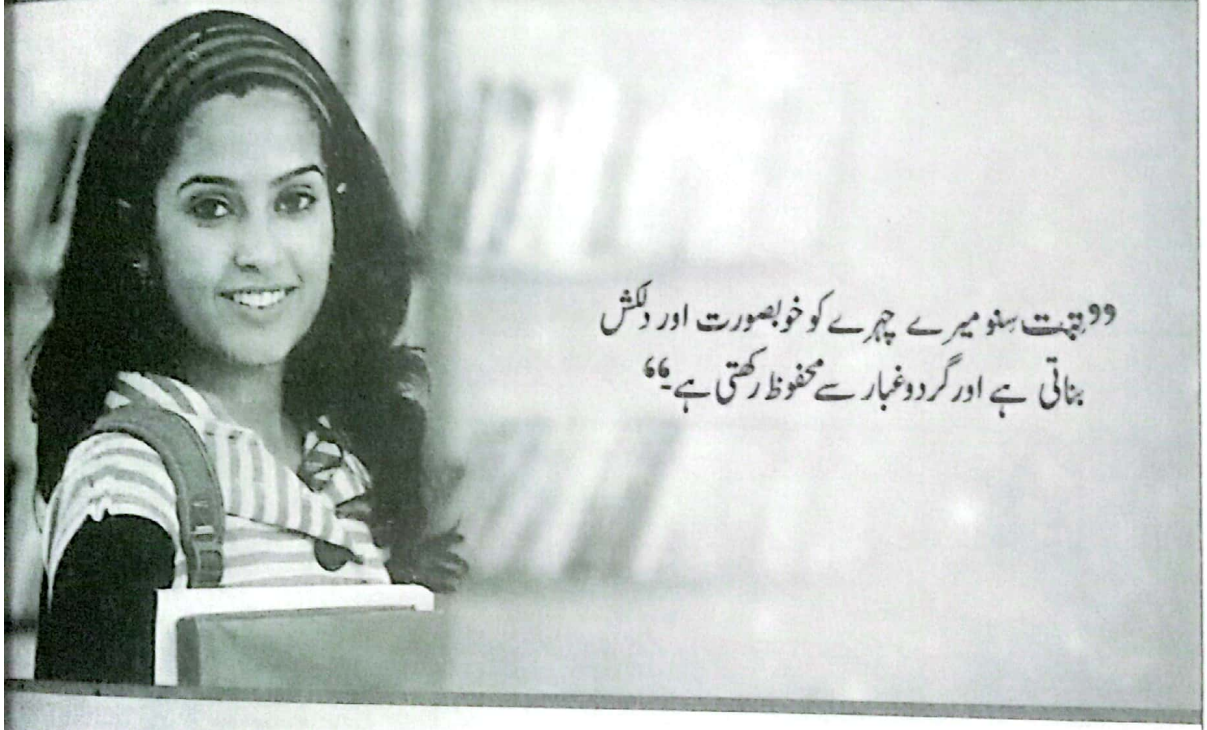

"تبت سنو میرے چہرے کو خوبصورت اور دلکش بناتی ہے اور گرد و غبار سے محفوظ رکھتی ہے۔"

تبت سنو کا روزانہ استعمال جلد کو ریشم کی طرح نرم و ملائم بنائے جھائیاں، داغ دھبے دور کرے اور اس کے خاص اجزاء جلد کو عمر کے اثرات اور جھریوں سے عرصہ دراز تک محفوظ رکھیں۔ بہتر نتائج کے لئے دن میں اور رات سونے سے پہلے استعمال کیجئے۔

تبت سنو۔ ایشیا کی مشہور ترین بیوٹی کریم

TS/44/2K11

اسلوب کی تفہیم

ڈاکٹر غلام شبیر رانا

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ ایک تخلیق کار جب پرورشِ لوح وقلم کا فریضہ انجام دیتا ہے تو وہ قلب اور روح کی گہرائیوں سے اس کو نمو بخشتا ہے۔ تخلیقِ ادب کے سلسلے میں یہ بات پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ ادب پارے اس وقت معرضِ وجود میں آتے ہیں جب تخلیق کار اپنے دل پر گزرنے والی ہر کیفیّت کو الفاظ کے قالب میں ڈھالتا ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ کلاسیکی ادب کے ساتھ لمحہء موجود کی تخلیقات ایک درخشاں روایت کی صورت میں منسلک ہیں۔ ایک مثالی نظام ہمہ وقت رو بہ عمل لایا جاتا رہا ہے جس کی بدولت تخلیق کار کی منفرد سوچ سے آگاہی ہوتی ہے۔ تخلیقی اظہار کے متعدد امکانات ہوا کرتے ہیں۔ ایک زِیرک، فعّال اور مستعد تخلیق کار اپنے صوابدیدی اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے ان میں سے کسی ایک کو اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے منتخب کرتا ہے یہی اس تخلیق کار کا اسلوب قرار پاتا ہے۔ سیف الدین سیف نے کہا تھا:

سیفؔ اندازِ بیاں بات بدل دیتا ہے ورنہ دنیا میں کوئی بات نئی بات نہیں

اس حقیقت کو کبھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ ایک تخلیق کار تخلیقِ فن کے لمحوں میں جب اپنے اشہب قلم کی جولانیاں دکھاتا ہے تو تخلیقِ فن کے اسے فعّال جذبے کو بالعموم غیر شخصی تصور کیا جاتا ہے۔ بادی النظر میں یہ بات واضح ہے کہ تخلیق کار کے لیے غیر شخصی معیار تک رسائی بہت کٹھن مرحلہ ہے۔ اس مرحلے پر وہ تخلیق ادب کو اپنی اوّلیں ترجیح سمجھتے ہوئے اپنے ذات کے بجائے فن پر اپنی توجہ مرکوز کر دیتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ درد وغم اور مصائب کا ایک غیر مختتم سلسلہ تخلیق کار کو ہر وقت بیدار رکھتا ہے۔ تخلیق کار پر یہ بات بہت جلد واضح ہو جاتی ہے کہ اس کی شخصیت کی نسبت تخلیقِ ادب کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اس کی تخلیقات کو دوام حاصل ہوگا اور انھی کی بدولت اس کا نام بھی زندہ رہے گا۔ اسلوب دراصل ایک تخلیق کار کے تخلیقی تجربوں کا آئینہ دار ہوتا ہے جسے دیکھ کر اس تخلیق کار کی شخصیت کے جملہ اسرار و رموز کی گرہ کشائی ممکن ہے۔ اسلوب کے ذریعے ایک نقّاد کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ تخلیق اور اس کے لاشعوری محرکات کے بارے میں سمجھ سکے۔ مسائلِ عصر اور حال کے تقاضوں کے بارے میں ادیب جو کچھ محسوس کرتا ہے اسلوب اس کو منعکس کرتا ہے۔ اسلوب کے ذریعے تخلیق کار کی ذاتی ترجیحات سے آگاہی ہوتی ہے۔ ایک مؤثر

اور جان دار اسلوب کا حامل تخلیق کار معاشرتی زندگی میں اپنے وجود کا خود اثبات کرتا ہے۔ ممتاز نقاد والٹر پٹیر نے کہا تھا:

"Style is a certain absolute and unique means of expressing a thing in all its intensity and colour" 1

(1 بہ حوالہ عبداللہ ڈاکٹر سید عبداللہ: ''اشارات تنقید''، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1993، صفحہ 268)

اردو زبان کے کلاسیکی ادب میں اسلوب کے بارے میں کافی معلومات ملتی ہیں۔ میر تقی میر کے اسلوب کے متعلق ان معاصرین کی وقیع رائے گہری معنویت کی حامل ہے۔ شیخ محمد ابراہیم ذوق نے اپنے فکر پرور اور بصیرت افروز لہجے میں میر تقی میرؔ کے انداز بیان کو نا قابل تقلید قرار دیا اور اس طرح ان کے اسلوب کی انفرادیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس عظیم شاعر کو خراج تحسین پیش کیا:

نہ ہوا، پر نہ ہوا، میرؔ کا انداز نصیب ذوقؔ یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

اسلوبیات ایک ایسا علم ہے جس کے اعجاز سے اس تمام عمل سے آگاہی حاصل ہوتی ہے جو پرورش لوح و قلم کے دوران تخلیق کار کے تجربے کی اساس ہے۔ بیسویں صدی کے آغاز میں آئی۔ اے رچرڈز نے سب سے پہلے اسلوبیات کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ 1950 کے بعد ماہرین لسانیات نے اسلوب اور اسلوبیات کو اطلاقی لسانیات کی ایک اہم شاخ کی حیثیت سے عالمی ادب میں ممتاز مقام عطا کیا۔ اسلوبیات کے ماہرین نے اس جانب توجہ دلائی کہ کسی بھی ادب پارے کا مطالعہ کرتے وقت سائنسی انداز فکر کو بروئے کار لانا از بس ضروری ہے۔ اسلوبیات نے یہ واضح کر دیا کہ لفظ کا علم فصاحت کہلاتا ہے اور کلام کے علم کو بلاغت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ بلاغت اپنی اصلیت کے اعتبار سے تخلیق کار کی اس خلاّقانہ استعداد کی مظہر ہے جس کی بدولت وہ کم الفاظ میں زیادہ اور وسیع مطالب و مفاہیم کے ابلاغ کو یقینی بناتا ہے۔ اسلوب کو بالعموم ایک ایسی چھلنی قرار دیا جاتا ہے جس میں سے تخلیق کار کی شخصیت چھن کر باہر نکلتی ہے اور قلم و قرطاس کا معتبر حوالہ بن کر اپنے وجود کا اثبات کرتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک تخلیق کار اپنا مافی الضمیر بیان کرنے کے لیے جو الفاظ منتخب کرتا ہے وہ نہ صرف اس کی قلبی، روحانی اور وجدانی کیفیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں بلکہ یہی الفاظ اس کے اسلوب کی اساس بھی قرار پاتے ہیں۔ اسلوب محض تخلیق کار کے افکار و خیالات کا مظہر نہیں ہوتا بلکہ اس کے پس پردہ یہ ایک آفاقی اور کائناتی عمل بھی ہے جو تاریخ کے مسلسل عمل کی جانب متوجہ کرتا ہے۔ یہی عمل افکارِ تازہ کی مشعل تھام کر جہان تازہ کی جانب سرگرم سفر رہنے کے جذبات کو مہمیز کرتا ہے۔ یہاں غالبؔ کی مثال پر غور کریں تو غالبؔ نے حریت فکر، ندرت تخیل اور جدت اظہار کو اپنے اسلوب کی اساس بنایا۔ ان کے اسلوب میں اظہار کی کیفیات نے ذاتی لاشعور کی حدود سے آگے نکل کر سماجی اور تاریخی لاشعور کی اتھاہ گہرائیوں تک رسائی حاصل کی۔ انھوں نے اپنے اسلوب میں جن عوامل کو پیش نظر رکھا وہ اجتماعیت اور روحِ عصر کے حقیقی ترجمان ہیں۔ ان کی انفرادیت مسلّمہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اس اسلوب میں پائی جانے والی

اجتماعیت اور روحِ عصر کی دھنک رنگ کیفیت کا حسین اور دلکش منظر قلب ونظر کو مسحور کر رہا ہے۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا　　دل جگر تشنۂ فریاد آیا
کوئی ویرانی سی ویرانی ہے　　دشت کو دیکھ کر گھر یاد آیا
درد منّت کشِ دوا نہ ہوا　　میں نہ اچھا ہوا، برا نہ ہوا
کیا وہ نمرود کی خدائی تھی　　بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا

اُسلوب ایک فعّال اور مستعد تخلیق کار کے فکر وخیال کا ایسا دلکش اور دل نشین پیرایۂ اظہار ہے، جو تخلیق کار کی تخلیقی فعالیت، ذہن و ذکاوت اور صناعی کا حقیقی استحسان کرنے کے مواقع سے فیضیاب کرتا ہے۔ مؤثر اسلوب کی اثر آفرینی کا کرشمہ قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اسلوب کی تاثیر دراصل تخلیق کار کے کمال فن کی دلیل ہے۔ عمدہ اسلوب کے لیے یہ اوصاف ناگزیر ہیں کہ وہ عام فہم انداز میں سامنے آئے۔ سادگی اور سلاست کا عنصر اس میں نمایاں ہو۔ اس کے مطالعہ سے قلب اور روح کو مسرّت اور آسودگی کا احساس ہو۔ اس کے علاوہ ایک مثالی اسلوب میں زندگی اور اس کے جملہ مسائل کے بارے میں ایک ٹھوس، واضح، قابل عمل اور قابل قبول رویہ اپنایا گیا ہو۔ زندگی کی حقیقی معنویت کو اجاگر کیا گیا ہو۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ ایک صاحبِ طرز ادیب اپنے اسلوب میں ایسے الفاظ کو منتخب کرتا ہے جو رنگ، خوشبو اور حسن وخوبی کے دلکش استعارے بن کر نہاں خانۂ دل کو معطّر کر دیتے ہیں۔ ان الفاظ میں پھولوں کی خوشبو کی عطر بیزی، اسلوب کے حسن کو چار چاند لگا دیتی ہے۔ ادبی اسلوب کا مطالعہ کرتے وقت ایک زیرک نقاد ان تمام امور کو زیر بحث لاتا ہے جن سے تخلیق کار، تخلیقِ فن کے لمحوں میں گزرا۔

ہر عہد میں بدلتے ہوئے نظریات، تصورات اور تحریکیں ادبی اسلوب پر بھی اثر انداز ہوتی رہی ہیں۔ 14 جنوری 1916ء کو سوئٹزر لینڈ کے شہر زیورخ سے شروع ہونے والی ڈاڈازم کی تحریک کو لیں تو اس کے بنیاد گزاروں میں ٹرسٹن زارا، ہیگو بال، ایلساٹین، ہینس ارپ، اور رچرڈ ہیلن بیک شامل تھے۔ اس منفی تحریک نے ''بلیک ہیومر'' کی صورت میں ایک ردِّعمل ظاہر کیا۔ اس تحریک نے فن کے مروّجہ اسالیب کے خلاف ایک ردِّعمل کی صورت اختیار کر لی 1924ء میں یہ منفی تحریک اپنے منطقی انجام کو پہنچی اور اب یہ تاریخ کے طوماروں میں دب چکی ہے۔ سرئیلزم (Surrealism) نے بیسویں صدی میں ادب اور فن کے اسالیب کو متاثر کیا۔ یہ لوگ تحت الشعور میں غوطہ زن ہو کر تخلیق فن کے داعی تھے۔ اس تحریک کا امتیازی پہلو ورائے واقعیت کہلاتا ہے۔ فرانس میں اس تحریک نے 1925ء سے 1940ء تک کے عرصے میں خوب رنگ جمایا۔ اس تحریک کے علم برداروں نے مشاہدے کے بجائے وجدان کو کلیدی اہمیت کا حامل قرار دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ تجزیے کے بجائے ادغام کو زیادہ اہمیت حاصل ہے اور حقیقت کا رخ تمثال کی طرف موڑنا اقتضائے وقت کے عین مطابق ہے۔ بہ قولِ غالبؔ

نہیں ہے کوئی بھی ایسا جہان میں غالبؔ　　جو جاگنے کو ملا دیوے آ کے خواب کے ساتھ

اردو تخلیق کاروں کے اسلوب پر سرّیلی اثرات کا جائزہ لینے سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ متعدد نامور ادیبوں کے اسلوب پر اس کے اثرات موجود ہیں۔اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

احمد علی کی کہانیوں میں سرئیلی عناصر نمایاں ہیں،منٹو کی کہانی ''پھندنے'' سرئیلی عناصر کی جانب توجہ دلاتی ہے،اردو کے جن اہم شعرا نے سرئیلی عناصر کو اپنے اسلوب میں جگہ دی ان میں ناصر کاظمی،منیر نیازی،محمد علوی اور عادل منصوری کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ممتاز نقاد محمد حسن عسکری نے سرئیلزم اور اس کی معنویت کو اجاگر کرنے کے سلسلے میں ایک مضمون لکھا جو 1949ء میں ''مخزن'' میں شائع ہوا۔آندرے برتوں (Andre Breton) جنھوں نے 1924ء میں سرئیلزم کا آغاز کیا ان کے خیالات کچھ اس قسم کے تھے کہ ''انسان کے فکر و خیال میں ایک ایسا نقطہ بہ ہر صورت موجود رہتا ہے جہاں حیات و ممات،حقیقت،واہمہ اور تخیل زمان و مکان کی حدود سے ماورا ہو جاتا ہے۔ورائے واقعیت اپنی نوعیت کے لحاظ سے اسی ایک نقطے کی تلاش میں سرگرداں ہے جہاں بلند و پست،صبح و شام،تلخ و شیریں،ماضی اور مستقبل کے تمام تضادات خیال و خواب بن جاتے ہیں۔'' امیجزم کی تحریک نے 1915ء میں ادب اور فنون لطیفہ کو متاثر کیا۔ٹی۔ایس۔ایلیٹ اور ایذرا پاؤنڈ نے اس پر بھرپور توجہ دی۔اردو ادب کے اسالیب پر اس کے جو اثرات مرتّب ہوئے ان کے اہم نکات میں روزمرہ زبان کا استعمال،فکر و نظر کے متنوّع اور جدید سانچوں کی تلاش،ابہام اور تصنع سے گلوخلاصی،ٹھوس،واضح اور مقصدیت سے لبریز ادب تخلیق کرنا اور ادب و شعر کی تخلیق کے لمحوں میں قلب اور روح کی گہرائیوں میں اتر جانے والی اثر آفرینی پر توجہ مرکوز کرنا شامل ہیں۔ادب کے ہزار ہا پہلو ہیں،سیکڑوں دلکشیاں ہیں ان سب کے پس پردہ اسلوب کی کارفرمائی ہے۔ہر تخلیق کار اپنے اسلوب کا جادو جگاتا ہے اور اس کے بعد آنے والا ایک نئے رنگ اور آہنگ کو بروئے کار لاتے ہوئے جلوہ گر ہوتا ہے۔فانی بدایونی نے کہا تھا

یہ کوچۂ قاتل ہے آباد ہی رہتا ہے　　اک خاک نشیں اٹھا، اک خاک نشیں آیا

شاعری میں اسلوب کے حوالے سے دو پہلو ہمیشہ کلیدی اہمیت کے حامل قرار دیئے گئے ہیں۔ان میں سے ایک تو اسلوب کا داخلی پہلو ہے اور دوسرا اسلوب کا خارجی پہلو ہے۔فکر و نظر کے ان دونوں پہلوؤں میں جو بعد المشرقین ہے اس پر بالعموم توجہ نہیں دی جاتی۔داخلی پہلو میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ تخلیق کار نے کیا کہا ہے جب کہ خارجی پہلو میں اس جانب توجہ دی جاتی ہے کہ کیسے کہا گیا ہے؟ داخلی پہلو میں خیال پر دھیان دیا جاتا ہے اسکے برعکس خارجی پہلو میں زبان و بیان پر توجہ مرکوز کی جاتی ہے۔داخلی پہلو میں مضمون کو محور کی حیثیت حاصل ہے جب کہ خارجی پہلو میں طرز ادا کو اہم گردانا جاتا ہے۔داخلی پہلو میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ تخلیق کار نے کس موضوع پر قلم اٹھایا ہے جب کہ خارجی پہلو میں ہیئت کو اہم قرار دیا جاتا ہے۔داخلی پہلو میں مادہ کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے۔جب کہ خارجی پہلو میں صورت کو مرکز نگاہ تسلیم کیا جاتا ہے۔داخلی پہلو میں مواد کو گنجینۂ معانی کا طلسم سمجھا جاتا ہے اس کے برعکس خارجی پہلو میں محض اسلوب کو فن کی اساس خیال کیا جاتا ہے۔ادب میں اسلوب کو ایسے سلیقے سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے جو

محض اصولوں پر انحصار نہیں کرتا بلکہ ایک تخلیق کار کے تجربات، احساسات، مشاہدات اور اخذ کردہ نتائج کی مؤثر ترسیل کی ایک ممکنہ صورت کے طور پر اپنی افادیت کو تسلیم کراتا ہے۔ نئے نئے تجربات کے ذریعے ادب کی ثروت میں اضافہ کرنا صاحب اسلوب تخلیق کار کا نصب العین ہوتا ہے۔ اردو نثر میں غالبؔ نے مکتوب نگاری کے سلسلے میں جو تخلیقی تجربہ کیا وہ ان کے منفرد اسلوب کا عمدہ نمونہ ہے۔ غالبؔ نے اپنے مکتوب نگاری کے اسلوب کو باتیں کرنے سے تعبیر کیا ہے۔ ہر قسم کے القاب و آداب کو ترک کر کے بے تکلفانہ لہجے میں مسلسل گفتگو کرنا ان کو بے حد مرغوب تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اسلوب میں مکالماتی کیفیت قاری کو مسحور کر دیتی ہے۔ وہ خود اپنے اسلوب کے بارے میں صراحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پیر و مرشد یہ خط لکھنا نہیں ہے، باتیں کرنی ہیں اور یہی سبب ہے کہ میں القاب و آداب نہیں لکھتا''

حاتم علی بیگ مہر کے نام ایک مکتوب میں غالب نے 18 نومبر 1858ء کو اپنے اسلوب کی جدّت اور منفرد تجربے کا ذکر کرتے ہوئے لکھا:

''مرزا صاحب! میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بہ زبان قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔''

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ باصلاحیت اور مستعد تخلیق کار اپنے اسلوب کے لیے جو طرزِ اظہار منتخب کرتے ہیں، وہی آنے والی نسلوں کے لیے طرزِ ادا اقرار پاتی ہے۔ مجید امجد نے اپنے اسلوب کے ذریعے اردو نظم کو نئے امکانات سے آشنا کیا۔ مجید امجد کے اسلوب میں ان کے ذاتی تجربے اور قوی مشاہدے کو بڑا عمل دخل ہے۔ ان کے منفرد اسلوب کی بدولت زندگی کے بارے میں ان کے احساسات کی یہ کیفیت قاری پر زندگی کی حقیقی معنویت کو منکشف کرتی ہے۔

''اس طرف باہر سرکوئے عدم
ایک طوفاں، ایک سیلِ بے اماں
ڈوبنے کو ہیں میرے شام و سحر کی کشتیاں
اے نگارِ دلستاں
اپنی نٹ کھٹ انکھڑیوں سے میری جانب جھانک بھی
زندگی، اے زندگی!!!''

ادبی اسلوب ایک تخلیق کار کو سمجھنے میں مدد و معاون ثابت ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ کہا جاتا ہے کہ اسلوب تو سجائے خود ایک تخلیق کار کی ذات ہے۔

کسی بھی زبان کے ادب کا مطالعہ کرتے وقت زبان کے صاحب طرز اور صاحب اسلوب تخلیق کاروں کے بارے میں

مکمل آ گہی ناگزیر ہے۔ان کا اسلوب ابدا آ شنا ہوتا ہے۔لفظ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اور یہ اسلوب ہی ہے جو تخلیق کار کے لیے شہرت عام اور بقائے دوام کا وسیلہ ثابت ہوتا ہے۔بہ قول میر تقی میرؔ:

پڑھتے پھریں گے گلیوں میں ان ریختوں کو لوگ مدّت رہیں گی یاد یہ باتیں ہماریاں

.....

حوالہ وتعلیقات

1) عبداللہ سید: اشارات تنقید، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، 1993، صفحہ 268۔
2) فرہنگ: کنگ۔ پتلی چھاچھ، بانہہ: کلائی، ونگ: چوڑی، تال: دھن۔

◆◆◆

اکادمی ادبیات پاکستان کے ''پاکستانی ادب کے معمار'' کے سلسلے کی ایک کتاب

ڈاکٹر انور سدید۔ شخصیت اور فن

مصنّف : پروفیسر سجاد نقوی

ضخامت 400 صفحات سے زائد

ملنے کا پتا:

اکادمی ادبیات پاکستان۔H-8/1، اسلام آباد

ناول کا فن اور نقّاد

انور سدید

راجر فاؤلر نے جدید تنقیدی اصطلاحات کی ایک لغت (A Dictionary of Modean Critical Terms) میں اصنافِ ادب کی درجہ بندی کی تو ناول کو شاعری اور ڈرامے کے بعد تیسرا مقام دیا لیکن ناول کو ادب کی تین اہم اصناف میں شمار کیا ''جو سب سے بعد میں معرضِ تخلیق میں آیا اور جس کی تعریف متعین کرنا بہت مشکل ہے'' اس صنفِ ادب کے مرزبوم فرانس میں ناول کو معقول ضخامت میں نثر کا ایک ٹکڑا قرار دیا گیا لیکن ''معقول ضخامت'' ایک لچک دار ''ترکیب'' تھی۔ اس ''ترکیب'' نے ناول نگاروں کو اختیار تمیزی کے ساتھ تخلیقی آزادی بھی دی۔ چنانچہ ناول کی ضخامت یا حجم پر پابندی عائد نہ کی جا سکی۔ دوسری طرف جب تخلیقی واقعہ نگاری کی ایک صنف ''افسانہ'' کو قبولِ عام حاصل ہو گیا تو ''ناول'' اور ''افسانہ'' میں مابہ الامتیاز قائم کرنا بھی ضروری ہو گیا۔ چنانچہ افسانے کو ایک ایسی تخلیق شمار کیا گیا، جسے ایک نشست میں آسانی اور طمانیت سے پڑھا جا سکتا تھا اور جو مختصر سی ضخامت میں زندگی کی ایک قاش سے متعارف اور جزو مدحیات کی ایک لہر سے آشنا کرا دیتا تھا۔ افسانے کی بنیاد واقعات پر ہوتی ہے اور ان واقعات کا مشاہدہ زندگی کے مختلف زمانی اوقات میں عمل میں آتا ہے۔ افسانہ نگار ان واقعات کو تخلیقی وجدان سے مربوط صورت دیتا اور ہمارے سامنے زندگی کی حقیقت کو مختصر صورت میں پیش کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس ناول کو ایک ایسے طویل قصّے سے موسوم کیا گیا جس میں زندگی کی کئی حقیقی قاشیں سما جاتی ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان کی رائے میں:

> ''ناول میں موجود صداقت اور حقیقت جزوی یا کلّی پھیلاؤ کے ساتھ ہمارے قلب و ذہن کو نہ صرف متاثر کرتی ہے بلکہ جھنجھوڑتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ ابعادی (Dimensional) بھی بن جاتا ہے۔ بشرطیکہ اس میں قصّے کی زیادہ جہات سمیٹ دی گئی ہوں۔ اس میں ایک سے زیادہ عہد بھی ہو سکتے ہیں۔ خاص طور پر جو ناول نگار تاریخ کی سیاسی، سماجی، معاشرتی، تہذیبی اور تمدّنی کروٹوں کا احاطہ کرتے ہیں، وہ ایک طویل عرصے کی حقیقی انسانی نفسیات اور اجتماعی شعور و لاشعور کے حوالے سے پڑھنے والوں کو تحیّر میں مبتلا کر دیتے ہیں۔''

چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی دور میں ناول کا ربط و تعلق مہم جوئی کے قصّوں کے ساتھ وابستہ کیا گیا، جو نئے نئے واقعات سامنے لاتے اور حیرتیں جگاتے تھے۔ راجر فاؤلر کے مطابق ''اس قسم کی نثر کو تجربے کی واردات بننے کا موقعہ ملا تو اس کے کچھ کھردرے کنارے اُبھر آئے۔ اسے گردوپیش اور ماحولیات کے مشاہدے، مطالعے اور ایک مخصوص دور کی زندگی کا نمائندہ سمجھا جانے لگا۔ اس غیر معمولی تبدیلی نے ناول کو زندگی کی زمینی حقیقت کے قریب کر دیا جس کی طرف ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے محولہ بالا اقتباس میں بھی اشارہ کیا ہے اس غیر معمولی تبدیلی نے ہی مہم جوئی کے بیانیے سے آغاز کرنے والے ناول کو نئے موضوعات سے متعارف کیا اور اس کے فنّی اظہار میں تنوّع اور پھیلاؤ کی وسیع تر فضا ہموار کی۔ اب ناول جتنی وسیع زندگی کا احاطہ کرتا تھا، اور جتنے اشخاص و کردار کو روشناس کراتا تھا، اس سے ناول کی ضخامت اور واقعاتی تنوّع بھی متاثر ہوتا چلا گیا۔

میرا خیال ہے کہ تاریخی وقائع نگاری میں جب تخیّلی، فرضی اور تخلیقی عنصر شامل کیا جانے لگا تو اس سے تاریخ کی طہارت تو ضرور داغدار ہوئی لیکن ناول کی صنف کو نئی کروٹ ملتی چلی گئی۔ دوسری طرف جب ناول میں مصنّف کی تخلیق کاری کا عنصر بڑھ گیا تو تاریخ کا مواد ناول کے پسِ منظر کے طور پر استعمال کیا جانے لگا اور بعض تاریخی کرداروں کو جو حقیقی تھے اور اپنے کارناموں کی وجہ سے ممتاز قرار پا چکے تھے، ناول کے کردار بنا لیے گئے اور مصنّف کے متخیلہ سے ان کے گرد ایک نئی نوع کی حاشیہ آرائی عمل میں آنے لگی۔ اس قسم کے ناولوں کو تاریخی ناول قرار دیا گیا لیکن حقیقتاً یہ تاریخ کی فنّی تعریف پر پورے نہیں اُترتے تھے اور ان میں بیان کیے گئے واقعات کو استناد کا درجہ حاصل نہیں تھا۔ اس قسم کے ناولوں کی ابتدائی صورت ہسپانیہ کے شہرۂ آفاق مصنّف سرونٹیز (Cervantes) کی تخلیقات میں دیکھی جا سکتی ہے۔ سرونٹیز نے ''ڈان کہوٹے'' (Don Quixote) لکھ کر اس صنفِ ادب کے ارتقاء میں نہ صرف گراں قدر حصّہ لیا بلکہ حقیقت کو فنطاسی (Fantasi) میں مدغم کرنے اور قاری کو حیرتوں میں گم کرنے کی کاوش کی۔ ناول میں فنطاسی نے جو دلچسپی پیدا کی تھی، اسے نہ صرف مقبولیت حاصل ہوئی بلکہ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ زمانۂ حال کے ناول نگاروں نے بھی فنطاسی کی تخلیق میں پوری دلچسپی لی ہے۔ آزادی کے بعد کے مقبول ناول نگاروں مثلاً نسیم حجازی، رئیس احمد جعفری، قیسی رامپوری اور ایم اسلم پر نظر ڈالیں تو ان کے ناولوں میں تاریخ سے بے دریغ استفادہ کی مثالیں سامنے آ جائیں گی۔ قرۃ العین حیدر نے تاریخ کے طویل دورانیے کو بالواسطہ طور پر استعمال کیا ہے اور ''آگ کا دریا''، ''آخرِ شب کے ہم سفر'' اور ''چاندنی بیگم'' جیسے ناول لکھے۔ شمس الرحمان فاروقی کے ناول ''کئی چاند تھے سرِ آسماں'' میں تاریخی تناظر اور حقیقی کرداروں کی معاونت سے ایک خاص دور کی تہذیبی بازیافت کی گئی ہے اور ان سب نے تحیّر کو اپنے اپنے انداز میں کروٹ دی ہے۔

مردِ ایّام کے ساتھ ناول کے متنوّع خدوخال واضح ہوتے چلے گئے اور ناول نگاروں نے ہیئت اور تیکنیک کے نئے نئے تجربات سے اپنی انفرادیت قائم کی تو ناول کے مطالعے میں خوش فکر قاری کی دلچسپی بڑھتی چلی گئی۔ یہ دلچسپی بالعموم ناول کے کہانی پن، زندگی کے انوکھے واقعات کی تلاش اور ان کے تخلیقی ارتباط سے پیدا کی جاتی۔ قاری اس تجربے کو اچھی طرح دیکھ لیتا

جس سے خود مصنّف گزرا تھا اور ناول کی بُنت میں شامل کر دیا گیا تھا۔ انگریزی ناول کے ایک نقّاد والٹر ایلن (Walter Allen) کے نزدیک واقعات ایک تاگے میں سلسلہ در سلسلہ بندھے ہوتے ہیں اور یہ ناول کے ہیرو کے کردار کی مختلف صورتوں کو ابھارتے ہیں لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ والٹر ایلن نے ان واقعات کو جو ہیرو کے عمل اور ردِّعمل کو کروٹ دیتے اور ناول کے داخلی تاثر کی افزائش کرتے ہیں، خالصتاً جذباتی واقعات قرار دیا ہے۔ مقصد شاید یہ ہے کہ واقعات کی ترتیب وتدوین اور ان سے ہیرو کے کردار کی تشکیل..... ناول کے تخلیقی اور تخیلی عمل کا نتیجہ ہے جبکہ ناول میں دلچسپی کا باعث یہ ہوتا ہے کہ یہ زندگی، افراد اور ماحول کی مختلف سمتوں میں اس طرح نمائندگی کرتا ہے کہ ناول زندگی کا عکس نظر آنے لگتا ہے اور واقعات کے فرضی، تخلیقی اور تخیلی ہونے کے باوجود، ناول میں پیش کی گئی حقیقت میں یقین پیدا ہو جاتا ہے۔

تاریخ اور رپورتاژ میں مصنّف واقعات کے ساتھ بندھا ہوتا ہے۔ لیکن ناول نگار کہانی کی ضرورت کے واقعات اور کرداروں کے خدوخال تخلیق کرنے میں آزاد ہے۔ راجر فاؤلر کے مطابق:

> ''ناول کی پیشکش میں ناول نگار ہیئت واسلوب کے اعلیٰ معیاروں کو مَس کرتا ہے اور وہ اپنا مواد دیومالا سے بھی حاصل کرتا ہے۔ وہ ناول کے ہیئتی ڈھانچے میں بھی کسی جامہ پابندی کو خاطر میں نہیں لاتا بلکہ ہر ناول نگار قصّے کی ضرورت کے مطابق خود اپنی ٹیکنیک بناتا، اسلوب استعمال کرتا اور اثر انگیزی کو کروٹ دیتا ہے۔''

چنانچہ یہ کہنا بھی مناسب ہے کہ ناول نگار مجموعی طور پر زندگی کے قاش قاش ٹکڑے جمع کرتا ہے لیکن وہ اپنے فنکارانہ عمل سے ان میں ربط وتسلسل بھی پیدا کرتا ہے اور ناول کی کہانی کو زندگی کے وسیع تر مدار میں جزرومد سے گزارتا ہے اور ایک خاص نوع کا تاثر پیدا کرنے کی سعی کرتا ہے۔ اکثر اوقات یہ تاثر اتنا حیرت آفریں ہوتا ہے کہ ناول کو فن کا شاہکار تسلیم کرنے کی بجائے ''پوری زندگی'' کے مماثل قرار دے دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ڈی، ایچ، لارنس (D.H. Lawarance) کے نزدیک ''ایک ناول انکشافِ حیات کا ایک مکمل وسیلہ ہے'' اور اس نے زندگی کی لطافتوں، رعنائیوں اور باریکیوں کو جب ناول کے آئینے سے دیکھا تو ایک نئے جہانِ معنی کا نظّارہ کیا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اس ''نظّارے'' کی تاب خود لارنس کا زمانہ نہیں لا سکا تھا۔

مغرب میں لارنس کے متذکرہ بالا مؤقف سے اختلاف کے زاویے بھی موجود ہیں، بلاشبہ ناول زندگی کی رنگ بدلتی قوسِ قزح اور حقیقت کی باریک ترین جزئیات کو صداقت اور جرأت سے پیش کرنے کا فن ہے لیکن یہ زندگی کا ہُو بہو چربہ نہیں اور اس کی تزئین آرائش یا منفی صورت ابھارنے میں مصنّف کا اپنا ذہن بھی کارفرما ہوتا ہے۔ چنانچہ اس خیال کے نقادوں نے ناول کو فن کا درجہ دینے سے بھی انکار کر دیا۔ جس کا شدّت سے بُرا منایا گیا اور چند نامور ناول نگاروں نے اس قسم کی رائے دینے والے ادیبوں کو نقاد تسلیم ہی نہیں کیا۔ ان میں انگریزی ادب کی ممتاز ناول نگار ورجینیا وولف بھی شامل ہے۔ اس نے ناول کو نقّاد کی دستبرد سے محفوظ رکھنے کی کوشش کی اور چیلنج کیا کہ ان میں سے کون سا نقّاد یہ کہہ سکتا ہے کہ ''ناول'' فن کا غلام ہے یا فن کی زنجیروں میں جکڑا

ہوا ہے اور وہ اس پر تنقیدی نظر ڈال سکتے ہیں۔'' فیلڈنگ (Fielding) نے تنقید کے حربوں کو مسترد کر دیا اور کہا کہ ''وہ ناول کے قواعد وضوابط اپنی مرضی سے خود مرتّب کرے گا۔'' میتھو آرنلڈ کے نزدیک ''اینا کرینا'' فن کا شاہکار نہیں بلکہ یہ زندگی کا ٹکڑا ہے۔'' ڈی، ایچ لارنس نے اپنی بات ایک اور انداز میں کہی ہے:

''ناول زندگی کی ایک روشن کتاب ہے لیکن کتابیں زندگی نہیں ہوتیں۔''

ناول کی پہچان اور تنقید کے سلسلے میں مغرب میں مربیّانہ انداز نمایاں ہے لیکن اس کی تنقید میں منفی زاویہ بھی موجود ہے جو ناول نگار کی ذاتی انا کا مظہر قرار دیا جا سکتا ہے چنانچہ یہاں یہ واضح کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سر والٹر ریلے نے سب سے پہلے ناول کو ''آرٹ فارم'' قرار دیا اور اصرار کیا کہ جب ناول پر تنقیدی نظر ڈالی جائے گی تو نقد ونظر کے سب قواعد وضوابط اس کی تفہیم اور درجہ بندی کے لیے استعمال کیے جائیں گے۔'' اس موضوع پر رسالہ ''علامت'' لاہور کے مدیر شیخ سعید صاحب سے بحث چھڑ گئی تو انہوں نے واضح کیا کہ

''ناول کی بے شمار قسمیں اور ان گنت ہیئتیں ہیں۔ ناول کا تنوّع ظاہر کرتا ہے کہ یہ ایک تیز رو دریا ہے۔ کردار، پلاٹ، ہیئت اور فضا کے اعتبار سے جب نقاد نے اس پر نظر ڈالی تو اس نے ناول کے کئی گوشے ایسے بھی آشکار کر دیئے جو عام قاری سے ہی نہیں خود ناول نگار کی نظروں سے بھی اوجھل تھے۔''

ان کی نظر میں ناول کی بہتر تفہیم اور تجزیے کے لیے نقّاد ناگزیر ہے۔ اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ چند انگریزی ناول نگاروں نے اپنی تخلیقی حدود سے فن کے بیّاض نقاد کو نکال باہر کیا۔ ہمارے ہاں اس قسم کا رویّہ ممتاز مفتی کے ہاں تاحیات پرورش پاتا رہا۔ ان کے نزدیک نقاد کو یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ فن پارے کو بقول ان کے اپنی ناقص تفہیم وتوضیح کا شکار بنائے اور اپنی دانست کے مطابق اس سے مطالب ومعانی اخذ کرتا پھرے۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ مفتی صاحب سے لاہور یا اسلام آباد میں ملاقات ہوتی تو وہ مجھے تنقید کو بالائے طاق رکھ کر افسانہ لکھنے کی تحریک پیدا کرتے جو ادب میں میری پہلی محبت تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ طویل عرصے کے بعد میں نے ''اوراق'' میں افسانہ ''کچی مٹی کا بند'' لکھا تو اس کی سب سے زیادہ داد ممتاز مفتی نے دی اور فرمایا ''صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا ہوا نہیں کہتے۔'' میں تنقید کو خیر باد کہے بغیر ان کے مشورے پر عمل کرنا چاہتا تھا لیکن شاید افسانے کی دیوی (Muse) مجھ سے ناراض ہو گئی تھی۔ دوسری طرف مفتی صاحب سے ڈاکٹر وزیر آغا کا ذکر آتا تو وہ یہ کہے بغیر نہ رہ سکتے:

''آغا! نے تنقید میں وقت ضائع کیا ہے۔ ان کا اصل میدان شاعری اور انشائیہ ہے۔''

تاہم دلچسپ بات یہ ہے کہ جب میں ان کے افسانوں کو موضوعِ بحث بناتا اور اپنی لکھی ہوئی رائے ممتاز مفتی صاحب کو پیش کرتا تو وہ بہت خوش ہوتے اور کہتے:

''اس افسانے کا یہ زاویہ تو میرے علم میں بھی نہیں تھا۔ یہ تمہاری دریافت ہے۔''

اوران کی خواہش ہوتی کہ ان سے ملنے والا ادیب ان کے افسانوں اور ناول کی زبانی تعریف کرنے کی بجائے ان پر مضمون لکھے اور پھر کسی اچھے ادبی پرچے میں چھپوادے۔ ممتاز مفتی کا یہ طریق بالکل فطری تھا۔ وہ تنقید سے اس لیے گھبراتے تھے کہ نقاد خدا جانے ان کے افسانے سے کیا اخذ کرے اور وہ ان کے امیج کو جوانہوں نے بڑی محنت سے بنایا تھا مسخ ہی نہ کردے۔ تنقید سے انکار اور نقاد کی نفی ممتاز مفتی کے داخل کی آواز نہیں تھی۔ یہ ان کا دفاعی حربہ تھا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ ''علامت'' کے مدیر سعید شیخ نے ورجینیا وولف، میتھو آرنلڈ اور اپنے ممتاز مفتی کے برعکس ناول کی بہتر تفہیم کے لیے نقاد کی ضرورت کا اعتراف اور اس کے وجود کا اثبات کیا۔

◆◆◆

تخلیق پڑھنے والوں کے لئے خوشخبری : تخلیق۔''اظہر جاوید نمبر'' کی کامیابی کے بعد یہ اعلان کرتے ہوئے ہمیں خوشی محسوس ہورہی ہے کہ ''تخلیق'' اب لاہور میں مندرجہ ذیل مقامات پر دستیاب ہوگا۔

کتاب سرائے

فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اُردو بازار۔ لاہور (فون: 042-37320318)

کلاسیک پبلشرز

چوک ریگل۔ دی مال، لاہور (فون: 042-37312977)

ایسٹ بُک سنٹر

6-B، دی مال لاہور (فون: 042-38543006)

شرافت نیوز ایجنسی

ٹورسٹ سٹریٹ، مدینہ مسجد چوک پرانی انارکلی، لاہور (0300-4766734)

قرۃ العین حیدر کی افسانہ نگاری

راشد محمود چدھڑ

قرۃ العین حیدر اردو ادب میں ایک نمایاں مقام رکھنے والی ناول اور افسانہ نگار تھیں۔ وہ 20 جنوری 1927ء کو علی گڑھ میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد سجاد حیدر یلدرم خود بھی ایک نامور افسانہ نگار تھے۔ قرۃ العین حیدر کو بچپن سے ہی لکھنے کا شوق تھا۔ صرف بارہ برس کی عمر میں ''بی چوہیا کی کہانی اس کی زبانی'' ان کی اوّلیں تحریر تھی، جو رسالہ ''پھول'' میں ستمبر 1938ء میں شائع ہوئی۔ پہلا افسانہ ''یہ باتیں'' ماہنامہ ہمایوں لاہور میں شائع ہوا۔ پہلا افسانوی مجموعہ ''ستاروں سے آگے'' 1947ء میں منظر عام پر آیا۔ دوسرا مجموعہ ''شیشے کے گھر'' اور اس کے علاوہ ''پت جھڑ کی آواز''، ''روشنی کی رفتار''، ''فصلِ گُل آئی، اجل آئی''، ''جہاں پھول کھلتے ہیں'' اور ''جگنوؤں کی دنیا'' ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کو زیادہ شہرت ان کے ناول ''آگ کا دریا'' اور ''آخر شب کے ہم سفر'' سے ملی۔ مگر افسانوں میں بھی ان کا اپنا مقام اور منفرد حیثیت ہے۔ ان کی افسانہ نگاری میں اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی اور ہندی الفاظ کو بہت دخل حاصل ہے۔ اور اردو افسانوں میں منظر نگاری کی نئی اور منفرد روایت بھی قرۃ العین نے قائم کی ہے۔ طاہر منصور فاروقی کے الفاظ میں:

> ''ادبی دنیا کی پوم پوم ڈارلنگ اور عینی آپا..... قرۃ العین حیدر..... کو زیادہ شہرت اپنے ناولوں سے ملی لیکن ان کی افسانہ نگاری بھی اپنی مثال آپ تھی۔ انہوں نے افسانے کو نیا اسلوب اور نئی ڈکشن دی''۔
>
> (طاہر منصور فاروقی، قرۃ العین کے بے مثال افسانے)

قرۃ العین حیدر کا دور اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کا دور تھا۔ مگر انہوں نے اپنا راستہ خود تلاش کیا۔ ابتدا میں رومانوی افسانے تحریر کیے جن کے کردار اونچے اور اعلیٰ طبقے سے لیے گیے تھے۔ بعد ازاں انھوں نے حقیقت نگاری کا رخ کیا اور اس دور کے تہذیبی اور معاشرتی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا۔ برصغیر پاک و ہند میں یہ زمانہ بٹوارے اور ہجرت کا زمانہ تھا۔ قرۃ العین حیدر بھی اس کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکیں۔ وطن کی زمین سے جدائی، قتل و غارت گری اور لوٹ کھسوٹ کے موضوعات ان کے افسانوں میں بھی ملتے ہیں۔ اور اس سارے انتشار نے صرف دو تہذیبوں کو ہی نہیں بلکہ قرۃ العین حیدر اور ان جیسے بہت سے ناول اور افسانہ نگاروں کی تحریروں میں جگہ حاصل کی۔ ڈاکٹر انوار احمد نے لکھا ہے:

''قرۃ العین حیدر نے اس بات کو کبھی نہیں چھپایا کہ اسے تقسیم ہند کے فیصلے نے آرزدہ کیا تھا۔''

(ڈاکٹر انوار احمد ''اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ'')

قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں منظر نگاری کا اچھوتا انداز ہے۔ ان کے بیشتر افسانوں کے آغاز میں انوکھی اور رومانوی منظر کشی پائی جاتی ہے۔ بلکہ بعض افسانوں کے درمیان یا آخر میں بھی واقعات نگاری کے دوران وہ منظر نگاری کے جوہر دکھاتی نظر آتی ہیں۔

''بیکٹ ہاؤس، المورَہ کے برآمدے پر چڑا کر کھانے کے لیے مثالی کھٹے انگوروں کی بیل پھیلی ہوئی تھی۔ برآمدے کے نیچے ایک گھنا درخت کھڑا تھا۔'' (جگنوؤں کی دنیا)

''لمبے چوڑے سیلے غسل خانے میں دن کو بھی اندھیرا رہتا تھا۔ پیتل کے جھال پال..... اس کے ہرے شیشوں والی بند کھڑکی..... پہروں وہ اس شیشے میں سے سامنے والے گھر کو تکتیں.....''

(حسب نسب)

''رات گئے شہر کے نیلگوں اندھیروں میں دور کہیں ایک سریلی دل دوز پاٹ دار آواز بلند ہوتی ہے۔''

(''اکثر اس طرح سے بھی رقص فغاں ہوتا ہے'')

قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں منظر نگاری نے دوسری خاتون مصنفین کو بھی متاثر کیا اور ان پر قرۃ العین حیدر کی منظر نگاری اور افسانوی اسلوب کے قوی اثرات نظر آتے ہیں۔ اس ضمن میں اشتیاق احمد نے اپنی تالیف ''جدیدیت کا تنقیدی تناظر'' میں قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں انوکھی تہذیبی منظر کشی کا ذکر کیا ہے اور رشیدہ رضویہ کے ابتدائی افسانوں پر قرۃ العین حیدر کی چھاپ بھی دریافت کی ہے۔ طاہر منصور فاروقی نے ''قرۃ العین حیدر کے بے مثال افسانے'' کے پیش لفظ میں قرۃ العین حیدر کی افسانوی تحریروں میں منظر نگاری کے بارے میں لکھا ہے:

''انہوں نے اردو افسانوں میں انگریزی الفاظ کے استعمال کی ایک نئی طرح ڈالی اور منظر نگاری کا جو اسلوب متعارف کرایا بعد کی افسانہ نگار اور ناول نگار خواتین کے لیے سکّہ رائج الوقت بن گیا''

(طاہر منصور فاروقی، قرۃ العین حیدر کے بے مثال افسانے)

منظر نگاری اور ڈکشن سے آگے بڑھتے ہوئے قرۃ العین حیدر کے افسانے، الجھن اور بے یقینی کی فضا میں عورت کی بے بنیادی جیسے موضوعات کو مغربی انداز میں مشرقی روایات کی لے میں بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے افسانوں میں رنج والم اور الجھاؤ کا وسیع کینوس موجود ہے۔ یہ الجھاؤ، تلخ تجربات اور نفسیاتی ناآسودگی کا باعث بنتا ہے اور ان کے افسانوی کردار الجھے اور عدم اعتماد کی فضاء میں گھرے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ''برف باری سے پہلے'' ''میں'' ''بوبی ممتاز'' ''سگرڈ ربانی'' اور ''

نشاط اسٹینلے'' جو مغربی طرز کی پارٹیوں میں اپنے اندرونی خوف کو چھپانے کے لیے خوش وخرم نظر آتے ہیں مگر مشرقی رویوں کی عکاسی بھی کرتے ہیں۔ ''سگرڈ ربانی'' بوبی ممتاز کو چاہتے ہوئے بھی چاہت نبھا نہیں سکتی اور بوبی ممتاز اختیارات کے باوجود سگرڈ کو اپنا نہیں سکتا۔ یہ تمام کردار ہی بے یقینی کی فضا میں نظر آتے ہیں۔ دوسری جانب ''نشاط اسٹینلے اپنی چاہت اور نسوانیت کا بوبی ممتاز سے عجب انداز میں اظہار کرتی ہے۔

''.....اگر ایک کتے پر بھی تم مہربان ہو اور اس کو کسی گلی میں ملو تو وہ دس فٹ کے فاصلے پر ہوگا تو اپنی دم ہلانے لگے گا..... یہ اظہار محبت کسی خود غرضی کی وجہ سے نہیں ہے۔'' (برف باری سے پہلے)

عورت کی بے بنیادی اور الم کی چبھن کے احساس کی موجودگی قرۃ العین کے افسانوی اسلوب کی ایک خاص بات ہے۔ ڈاکٹر سلیم اختر قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں عورت کی بے بنیادی کے بارے میں کچھ اس طرح رائے دیتے ہیں۔

''قرۃ العین کے افسانوں میں انسان کے بالعموم اور عورت کے بالخصوص میں بے جڑ (Rootless) ہونے کے الم کی چبھن کا شدید احساس ملتا ہے۔'' (''افسانہ حقیقت سے علامت تک'')

قرۃ العین حیدر کے افسانوں میں ''مکسڈ کلچر'' ملتا ہے جو نہ تو ملکی حدود کا محتاج ہے اور نہ ہی مذہب اور عقیدے کا۔ ان کے افسانوں میں انگریز، ہندو اور سکھ بالکل اسی طرح زندگی گزارتے اور عشق ومحبت کا اظہار کرتے نظر آتے ہیں جیسے کہ وہ سب کے سب مسلمان ہیں یا پھر سب کے سب انگریز، صرف ہندو یا سکھ ہی نہیں ہیں۔ مگر یہ خلا خلا ہی رہتا ہے۔ محض محبت کے اظہار کے لیے تو یہ اکٹھے ہوتے ہیں، خوشیاں مناتے ہیں۔ دوستیاں رکھتے ہیں مگر کسی بھی ازدواجی اور مکمل گھریلو معاشرتی زندگی کا تانا بانا بنانے سے قاصر ہیں۔ ملے جلے کلچر کا یہ رومان صرف ایک خواہش ہی بن کر رہ جاتا ہے۔ جسے حقیقت کا رنگ دینا نہ صرف قرۃ العین حیدر بلکہ ان کرداروں کے لیے بھی مشکل ہے۔

ان کے افسانوں میں عورت کے لیے نام نہاد پاکدامنی کا جو احساس ہے وہ بھی حقیقت سے قریب تر نہیں۔ عورت کے جسم کو بے معنی اور بے مصرف بیان کیا گیا ہے۔ جیسا کہ ''پت جھڑ کی آواز'' کی مس تنویر فاطمہ۔ اس کی بہ نسبت ''سوگندھی'' بھرپور اور مکمل عورت ہے جیسا کہ ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں۔

''سوگندھی مکمل اور بھرپور جنسی زندگی گزارنے اور بعض کرداری اوصاف کی بنا پر نام نہاد شریف زادیوں سے بہتر ہے۔'' (ڈاکٹر سلیم اختر، افسانہ حقیقت سے علامت تک، ص 136)

قرۃ العین کے افسانوں میں ہمیں گلوبل ولیج کی جھلک بھی ملتی ہے۔ انہوں نے افسانوی اسلوب میں مذہب، رنگ و نسل قومیت اور ہر طرح کی محدود معاشرتی اور سماجی حدود کو پھلانگ کر اپنا جدا انداز قائم کیا ہے۔ اپنے فن کے اس اسلوب کے بارے میں وہ خود کہتی ہیں کہ:

''.....میں نے کوئی نسخے نہیں پیش کیے۔میری بنیادی سوچ انسان پرستی رہی ہے۔اس کی ساری دنیا کو آج کل ضرورت ہے۔'' (طاہر منصور فاروقی،قرۃ العین حیدر کے بے مثال افسانے)

قرۃ العین حیدر کے افسانوں کے بارے میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان میں کسی طرح کا ٹھہراؤ نہیں ہے۔وہ کسی اعلیٰ طبقے کے بارے میں ہوں یا ''کارمن'' اور ''ستاروں سے آگے'' کی طرح کسی ملازم پیشہ ہاسٹل میں رہنے والے اور بگھیوں پر سفر کرنے والے لوگوں کے بارے میں،ان میں ایک انجانی منزل کی جستجو پائی جاتی ہے اور یہی جستجو قرۃ العین حیدر کے فن کو متحرک اور بااثر رکھتی ہے۔ڈاکٹر انوار احمد لکھتے ہیں

''گویا قرۃ العین کے افسانوں میں محسوسات،فکر،تکنیک اور دیگر فنی وسائل حالت انجماد میں نہیں.....''

(ڈاکٹر انور احمد،اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ ص ۳۸۲)

محمود ہاشمی کے مطابق:

''قرۃ العین نے اس پُل کی تصویر کشی کی ہے۔جس پر سے فریب خوردہ امید گزیدہ روحوں کے مجروح،فگار قافلے گزر رہے ہیں''۔ (ڈاکٹر انور احمد،اردو افسانہ ایک صدی کا قصہ ص 282)

ان بنیادی خوبیوں کی بنا پر قرۃ العین حیدر کو اُردو میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔

◆◆◆

''تخلیق'' کراچی میں مندرجہ ذیل مقامات پر دستیاب ہوگا

اکادمی بازیافت

M-17،کتاب مارکیٹ،سٹریٹ نمبر 3،اردو بازار،کراچی۔74200(فون:021-32751324)

دانش کدہ

زہرا اسکوائر،بلاک نمبر 6،گلشنِ اقبال،راشد منہاس روڈ،کراچی۔75300

(فون:021-34966138)

شاہین (کینیڈا)

رہائی

نسیمِ صبح کا لمسِ لطیف و سحر آگیں
شگفتِ گل کا وہ اندازِ بے حجابانہ
وہ اک سکوت کا عالم وہ اک راب کی لَے
حقیقتیں بھی برنگِ فسون و افسانہ

ارادتیں دلِ وحشی کی مفتیوں کے حضور
تضادِ غم کی یہ باتیں ہیں میرے سامنے کی
کسی سے مل کے کبھی اور کبھی بچھڑنے پر
وہی صداقتِ جذبات دل کو تھامنے کی

دل و نگاہ کی دیر آشنائیاں تسلیم
کہوں میں کس سے کہ جاں کا عجیب عالم ہے
جو دھڑکنوں کی ہمیشہ گواہی دیتا تھا
وہ ایک نام اب اک حسرتِ مجسّم ہے

قرار آنکھ کو ملتا نہیں سراب صفت
کنارِ آبِ رواں ہی نہ ماہ پاروں میں
دکھائی دیتی ہے اکثر مجھے وہی صورت
جسے میں آج بھی پہچان لوں ہزاروں میں

خبر رساں کی کسی اِک غلط بیانی پر
کیا ہوا ہے مقفّل بڑے زمانے سے
کسی نے ایک کہن سال جسم میں مجھ کو
کوئی بچائے کہ میں جی سکوں ٹھکانے سے

ثمینہ سیّد

تم سے کچھ نہیں کہنا

ہم نے سوچ رکھا ہے
چاہے دل کی ہر خواہش
زندگی کی آنکھوں سے اشک بن کے
بہہ جائے
چاہے اب مکینوں پر
گھر کی ساری دیواریں
چھت سمیت گر جائیں
اور
بے مقدّر رہم
اِس بدن کے ملبے میں
خود ہی کیوں نہ دب جائیں
تم سے کچھ نہیں کہنا
تم سے کچھ نہیں کہنا

OOO

علیم صبا نویدی (انڈیا)

نظمیں

اُنگلیوں کا لمس بھی
برف کا دریا لگا ہے رات بھر
خُشک سا ہے شمس بھی

O

تنہا تنہا دل جلا
مستقل تھا آرزوؤں کا دُھواں
بجھ گیا تھا حوصلہ

O

مرقدوں کے آس پاس
آگہی کی نور، آگیں کیفیت
زندگی کا اِنعکاس

O

اب وہ پس منظر نہیں
دور تک سر پر مسلّط ہے فلک
سائباں ہے، گھر نہیں

O

آزمائش کی گھڑی
طوق گردن میں، عذابِ دو جہاں
راحتوں کی پھلجھڑی

میں کہاں مغرور تھا
تھی کُشادہ میرے فن کی سرزمیں
ذہن کوہِ طور تھا

O

عیب بھی اب ہے ہُنر
جب مداری خود کو سمجھے باکمال
سیپ بن کیسا گہر

O

سامنے سچائیاں
مُسکراتے موسموں کے پھول پھل
درد کی گہرائیاں

O

مَن کا آنگن سونا سا
مِل رہے ہیں سانپ پیڑوں سے گلے
قَد مگر ہے بُونا سا

علی عباس اُمید (انڈیا)

ترسیل کا المیہ

دورآواز کے صحرا میں
کوئی لمحۂ سرد
چُھو کے احساس کے شانوں کو
بکھر جاتا ہے
اور پھر لفظوں کے رنگین حصار
قید کر لیتے ہیں معنی کُو، سکوت
بکھرے لمحے کو سمیٹے ہوئے
صحرا سے پرے
چلتا جاتا ہے
یہاں تک کہ وہ کھو جاتا ہے
اور پھر لفظوں کے رنگین حصار
ہجر معنی میں بکھر جاتے ہیں خوابوں کی طرح!
دورآواز کے صحرا میں
وہی لمحۂ سرد
چُھو کے اِحساس کے شانوں کو
تلاطم کی طرح
لفظ و معنی کے سمندر میں چلا جاتا ہے
اورآواز کے صحرا میں
خیالوں کے طلسم
ناچتے پھرتے ہیں
بے جان بگولوں کی طرح!!

فوقیہ مشتاق (امریکہ)

برف کی ریت

میں چاروں طرف برف کی ریت سے
اپنے مخصوص انداز سے
غم زدہ ساز پر
رقص کرتی ہوئی برف سے
ہلکی بارش کبھی جب لپٹ جاتی ہے
برف خود میں سمٹ جاتی ہے
دور تک اونچے اونچے درخت
ننگی شاخیں لیئے
خود سے بھی بے خبر
اپنی ویران آنکھوں سے تکتے ہوئے
کتنے خاموش ہیں
سارے گھر اپنے اوپر فسردہ ملے
جانے کس خوف کے خول میں بند ہیں
ہجر کے نور کی اک رِدا
سر پہ تانے ہوئے آسماں
کس قدر صبر سے
اپنی باہوں میں سارے مناظر لیے
ایسا لگتا ہے صدیوں سے
اپنے فرائض پہ مامور ہے
اور شیشے کے اِس پار
کافی سے اُڑتی ہوئی تیز خوشبو
بدن میں سمانے کو بے تاب ہے
جانتی ہیں یہ آنکھیں کہ سب خواب ہے

بٹی ہوئی فصل

نجم الحسن رضوی

''اور اگر کوئی دیکھ لیتا تو؟'' میں نے غصّے سے کہا، ''واپس چلو میں ابّا کو بتاؤں گا!'' ''ناراض کیوں ہوتے ہو چھوٹے شاہ جی!'' بچلّ ڈھٹائی سے ہنس کر بولا، ''میں نے کہا کیا ہے، وہ تو خود بڑی.....!''

میں نے ابھی کچھ دیر پہلے بچلّ کو تالاب کے قریب درختوں اور جھاڑیوں سے ڈھکے ہوئے ٹیلوں کی آڑ میں اس آفت کی پرکالہ کے ساتھ قلابازیاں کھاتے دیکھا تھا۔

بچلّ کے بارے میں میرے خیالات کبھی بھی نیک نہیں تھے۔ میں تو اس کمبخت کے ساتھ آنا ہی نہیں چاہتا تھا مگر شہر سے اتنی دور اکیلے گوٹھ میں آنا اور کھیت پر فصل کی بٹائی کے وقت ہاریوں کے پاس موجود رہنا بہت ضروری تھا اور ابّا چاہتے تھے کہ کوئی میرے ساتھ رہے۔

بچلّ مجھ سے عمر میں بڑا تھا اور اس کے بارے میں ابّا کا کہنا تھا کہ ہوشیار لڑکا ہے اور ہر قسم کے حالات سے اچھی طرح نمٹنا جانتا ہے۔

بیل گاڑی پر گندم کی بوریاں لادی جا چکی تھیں اور قائم ہاری اور اس کے گھر والے، کھیت پر کام کرنے والی عورتیں اور دوسرے لوگ ہمیں رخصت کرنے کو تیار کھڑے تھے۔ ''اچھا ادا قائم،'' میں نے کہا..... ''ہم لوگ چلتے ہیں!''

بیل گاڑی والے نے بیلوں کو پچکار کے گاڑی آگے بڑھائی اور بند کی طرف جانے والے کچے راستے پر مڑ گیا۔

قائم ہاری نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیکر گرمجوشی سے مصافحہ کیا اور پھر اپنا ہاتھ سینے سے لگا کے بولا، ''شاہ جی کو میرا اسلام بولنا، اللہ سائیں آپ کو خوش رکھے!'' بہت سے ہاتھ مجھے احترام سے رخصت کرنے کے لئے اٹھے ہوئے تھے۔

میں نے جواباً ہاتھ لہرایا اور پھر سائیکل پر سوار ہو گیا۔ بچلّ پہلے ہی وہاں سے کھسک چکا تھا اور اسکی سائیکل اس وقت نیم کے اس پیڑ کے پاس پہنچ چکی تھی جس کے پیچھے گندے تالاب میں ہرا ہرا رنگ بکھرا ہوا تھا جس میں کہیں کہیں کنول کھلے ہوئے تھے۔

تالاب کے پیچھے ساری زمین بنجر تھی جس پر کئی جگہ سیم وتھور کی سبزی اور سفیدی پھیلی ہوئی تھی۔ کھارے پانی کی بہتات کی وجہ سے اراضی پر کاشت بند تھی۔ شُکر ہے سڑک کی دوسری جانب ہمارا مختصر سا زمین کا ٹکڑا ابھی آباد تھا جسے ہم نے قائم ہاری کو ٹھیکے پر دے رکھا تھا۔ آبیانہ محصول اور فصل کی بوائی کا خرچ بیجوں سمیت ہم دیتے تھے اور محنت قائم اور اس کے گھر والوں کی۔ فصل آدھی ہماری اور آدھی اس کی۔ بٹائی کا کام پورا ہونے پر ہمارے حصّے کی بوریاں ہمارے گھر پہنچا دی جاتیں۔

اور اس وقت ہم لوگ یہی کام ختم کر کے گھر واپس لوٹ رہے تھے۔ میں نے سائیکل کی رفتار بڑھائی اور بیل گاڑی کو پیچھے چھوڑ کے بچلّ کے پاس پہنچ گیا جو اب اینٹوں کے بھٹّے کے پاس سے گزر رہا تھا۔ چاروں طرف سرخ اینٹوں کے ڈھیر تھے۔ ایک طرف بہت سے مزدور کام کر رہے تھے جن میں عورتیں بھی شامل تھیں وہ سب آہنی سانچوں میں اینٹوں کے لئے گارا ڈال رہے تھے۔ ان عورتوں کے بیچوں بیچ مجھے وہ بھی نظر آئی، لال پھولوں والی ملگجی شلوار قمیض اور عنابی اوڑھنی میں وہ سب سے الگ تھی۔

''اچھا تو وہ رہی تمہاری دوست،'' میں نے بچلّ کے برابر پہنچتے ہوئے اس سے سوال کیا، ''کیا نام ہے اس کا؟''

''بولتی ہے سب اسے پھلی کہتے ہیں۔ پھلی ہو یا مونگ پھلی، ہے بڑی.....!'' اس نے اپنی ایک آنکھ دبائی اور مجھے پھر سے غصہ آ گیا۔

تیری عادتیں بہت خراب ہیں بچلّ، کسی دن بہت بری ہوگی تیرے ساتھ.....!'' وہ ہنسا..... ''چھوٹے شاہ جی آپ ناراض ہوتے ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے، ویسے سچ بتائیں آپ کو نہیں اچھی لگتی وہ؟''

''کیا؟'' میں گڑبڑا کے سائیکل سے گرتے گرتے بچا..... ''کیا بکواس کر رہے ہو!'' ''نہیں نہیں'' وہ بولا ''میں تو ایسے ہی کہہ رہا تھا۔ اصل میں جب ہم ہفتے بھر پہلے آئے تھے تو مجھے لگا تھا کہ اس دن آپ اسے کچھ زیادہ ہی غور سے دیکھ رہے تھے۔ ایسے وقت میں عینک کے پیچھے آپ کی آنکھیں زیادہ بڑی لگنے لگتی ہیں!''

''کس دن کی بات کر رہے ہو؟'' میں نے تنک کے پوچھا۔

''ارے اس دن!'' وہ بولا، ''یاد نہیں کھیت میں کام کرتے ہوئے جب اس کا ہاتھ کٹ گیا تھا تو آپ نے ہی تو اسے تھیلے میں سے مرہم کا ٹیوب نکال کے دیا تھا!''

''اچھا ہاں،'' میں نے کہا..... ''بے چاری!''

''بے چاری نہیں چھوٹے شاہ جی، بڑی اونچی شے ہے وہ!''

میں نے کہا..... ''ہاں، جبھی تو اس کے ساتھ تو بڑا اونچا اڑ رہا ہے۔ بچلّ میں دیکھ رہا ہوں، لخ لعنت!'' میں نے اسے پنجہ دکھایا۔

بچلّ اچانک سائیکل سے کود پڑا۔ سائیکل کی زنجیر اتر گئی تھی۔ وہ اسے ٹھیک کرنے لگا۔ میں نے بھی سائیکل روک دی۔

ہم لوگ اس وقت قائم ہاری کے گوٹھ کے باہر تھے۔ دور کچے مکانوں اور مٹی کے باڑوں پر مشتمل چھوٹی سی بستی نظر آ رہی تھی جہاں کیکر، کھجور اور نیم کے درختوں کے جھنڈ تھے۔

''پھلی بھی یہیں رہتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

بچلّ نے گوٹھ کی سمت دیکھا۔ ''جی سائیں، وہ جو مسجد ہے نا، اس کے پیچھے الٹے ہاتھ پر بھینسوں والے باڑے کے ساتھ اسکا گھر ہے!''

''مگر وہ تو قائم کے بھائی کا گھر ہے!''

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔'' وہ بولا ''وہ ادا قائم کے بھائی کی دھی ہے نا!''

''کیا؟ اچھا، مجھے پتہ نہیں تھا!'' میں نے کہا۔

''تو پتہ کرو نا چھوٹے شاہ جی!'' بچلّ شرارت سے بولا، ''مجھ سے پوچھیں، میں سب جانتا ہوں!'' وہ دوبارہ سائیکل پر سوار ہو گیا۔

اس میں کوئی شک نہیں۔ میں نے پیڈل پر پاؤں رکھتے ہوئے سوچا، بچلّ سب کچھ جانتا ہے۔ جب سے میں نے اسے جانا تھا اس کے بارے میں یہی خیال ذہن میں آیا تھا کہ وہ اپنی عمر سے کہیں زیادہ جانتا ہے۔ ویسے تو وہ عمر میں مجھ سے تھوڑا سا ہی بڑا تھا مگر لگتا تھا کہ اس کے پیٹ میں داڑھی ہے، اور اسکی باتیں.....توبہ، توبہ!

بچلّ کا باپ خیر بخش ابا کے دفتر میں چپراسی تھا اور وہ اس کے خلوص اور وفاداری سے بہت متاثر تھے۔ اس لئے جب گھر کے لئے بازار سے آنے والے دودھ میں صرف پانی کا ذائقہ باقی رہ گیا تو ابا نے خود اپنی بھینس رکھنے کا فیصلہ کر لیا اور اس وقت خیر بخش اور اس کے گھر والوں نے بھینس کی دیکھ بھال کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیں اور اس طرح خیر بخش اور اس کا خاندان بچلّ سمیت ہمارے گھر کے احاطے میں موجود سرونٹ کوارٹر میں آ بسا۔ بچلّ سے میری دوستی تب سے شروع ہوئی تھی۔

میں شروع شروع میں اسے خیر بخش کے ساتھ احاطے کے پچھلے حصے میں بندھی ہوئی بھینس کو چارہ ڈالتے اور چھپر کی صفائی کرتے دیکھتا اور حیران ہوتا کہ اسے سب کچھ آتا تھا۔ وہ بھینس کے سینگوں سے ڈرے بغیر اپنے باپ کے ساتھ مل کے مزے سے بھینس کے لئے سانی تیار کرتا رہتا یا پھر گوبر صاف کرتے ہوئے ہنستا رہتا۔

گھر کے باہر وہ بے تکلفی سے ہمارے کھیلوں میں بھی شریک ہو جاتا۔ گلّی ڈنڈے اور 'لکڑ بڈی' سے اس خاص دلچسپی تھی۔ معلوم نہیں اس کھیل کو اصل میں کیا کہتے تھے مگر ہم لوگوں نے کبڈی کے وزن پر اس کا نام 'لکڑ بڈی' رکھا تھا۔ اس میں دو فریق لکڑیوں سے کبڈی کھیلتے تھے۔ ایک لکیر زمین پر کھینچی جاتی تھی اور پھر ہاکی کی طرح ایک خم دار لکڑی سے دوسرے فریق کی لکڑی کو اس زور سے چوٹ ماری جاتی تھی کہ وہ لکیر پار کر جائے۔ اگر لکڑی لکیر کے پار چلی جاتی تو حملہ آور کھلاڑی جیت جاتا تھا اور پٹی

ہوئی لکڑی اسکی ملکیت ہو جاتی تھی۔ اس کھیل کے لئے سب لڑکے گولف کھیلنے والوں کی طرح ایک تھیلے میں خم دار لکڑیوں کا ذخیرہ ساتھ لے کے گھومتے تھے اس میں دو شاخے زیادہ ہوتے۔

بچل 'لکڑ بڈی' کے میچ میں ہم سب کو ہرا دیتا۔ وہ ہم سب میں بڑا تھا اس لئے اس کی ماریں جسے آپ سروس بھی کہہ سکتے ہیں میں بڑا دم تھا۔ چوٹ کھا کے فریق ثانی کی لکڑی اچھل کے لکیر کے پار جا گرتی۔

''یہی تو اس کھیل کا گر ہے چھوٹے شاہ جی!'' وہ کہتا، ''آپ ہر لکڑی جیت سکتے ہیں بس ذرا دم چاہیے!''

''اچھا تو.....!'' میں نے اونچے نیچے کچے راستے پر سائیکل کی رفتار کم کرتے ہوئے پوچھا، ''تو اور کیا جانتا ہے پھلی کے بارے میں؟''

بچل برابر میں آ گیا۔ ''وہ اینٹوں کے بھٹے پر بھی کام کرتی ہے، عورتوں کے ساتھ!''

''وہ تو میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے!'' میں نے چڑ کے کہا۔

''اس کے بھائی کی شادی پھلی کی نند سے ہوئی ہے، یعنی پھلی کے مٹرس (خاوند) کی بھین سے!''

''کیا؟'' یہ واقعی میرے لئے نئی خبر تھی..... ''تو کیا پھلی؟''

''ہاں.....!'' بچل اپنی بات میں ڈرامے کا زور پیدا کر کے بولا..... ''اس کا بیاہ ہو چکا ہے۔ اٹے سٹے کی شادی ہے یہ یعنی بٹائی والی، اس کا خاوند اسکی ماسی کا پُت (بیٹا) ہے اور اس کی ماسی کا داماد اس کا بھائی!''

''پھر تو یہ بہت بری بات ہے بچل، تو ایک بیاہی لڑکی کو ورغلا رہا ہے!'' میں نے پیڈل پر پاؤں مارتے ہوئے کہا۔

''میں کیا کر رہا ہوں؟'' وہ بولا ''میں تو آپ کے ساتھ کام پر آتا ہوں، وہ خود ہی بار بار میرے پاس آ کے مخول کرتی ہے' چھوٹے شاہ جی' آپ کو پتہ نہیں فصل پک جائے تو وہ ہر وقت کٹنے کو راضی لگتی ہے!'' مجھے پھر اس پر غصہ آیا۔ بھئی بڑا ہی بدمعاش ہے یہ تو۔ اسکی تو سچ مچ میں پٹائی ہونی چاہیے، اسی کیکر کی لکڑی سے جس سے وہ دوسروں کی لکڑیاں جیتتا ہے۔

اس دن بھی وہ ہاتھ جوڑ کے میری خوشامد کر رہا تھا۔ ''چھوٹے شاہ جی غلطی ہو گئی، بڑے شاہ جی سے مت کہنا ورنہ وہ بابا کو بتائیں گے اور وہ کیکر کی لکڑی سے مار مار کے میرا کچومر نکال دے گا۔''

مگر وہ حرکت ہی ایسی کرتا تھا۔ 'لکڑ بڈی' کھیلتے ہوئے جب بھی کوئی نئی لکڑی اس کے ہاتھ آتی تو وہ مارے خوشی کے دوسرے فریق کو لپٹا کے اس کا منہ چوم لیتا۔ لڑکے اسکی حرکت سے نالاں تھے۔ ایسے میں وہ مجھ سے شکایت کرتے مگر وہ ہاتھ پاؤں جوڑنے لگتا۔ وہ اپنے کیکر کے ہتھیار گھر میں نہیں رکھتا تھا کیونکہ اگر وہ اسکی ماں کے ہاتھ لگ جاتے تو وہ انھیں چولھے میں جھونک دیتی اور اگر باپ کی نظر پڑتی تو وہ ان سے اسکی پیٹھ کی مضبوطی کا امتحان لیتا مگر اس کے باوجود 'لکڑ بڈی' سے بچل کی رغبت کم نہ ہوئی۔ اس کے چوبی اسلحہ خانے میں کیکر کے دو شاخے بڑھتے جا رہے تھے۔

اچانک ایک کتا دوڑتا ہوا میرے سامنے سے گزرا اور میری سائیکل اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔ میں نے توازن ٹھیک کرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ بچل بڑے مزے سے کوئی فلمی گیت گنگناتا اپنی دھن میں آگے بڑھتا جا رہا تھا اور بیل گاڑی گندم کی بوریوں سے لدی پھندی پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ میں نے اس کے برابر پہنچتے ہوئے ایک بار پھر بات شروع کی..... ''تو تمہارا یہ کہنا ہے کہ اس گڑبڑ میں تمھارا کوئی ہاتھ نہیں؟''

''میں نے کب کہا چھوٹے شاہ جی، مگر دیکھو نا جب کوئی میرے پالے میں لکڑی پھینک دے تو.....!''

''تو.....؟'' میں نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''میں نے خود کچھ نہیں کیا''، وہ بولا..... ''صرف لکڑی.....!''

کمینہ! میں نے دل میں اسے کوسا، یہ بھی کوئی 'لکڑ بڈی' کا کھیل ہے۔ میں اسے شک کا فائدہ دینے کے لئے مطلق تیار نہیں تھا۔ اس کی مستیاں مجھے پتہ تھیں۔ ایک دن 'لکڑ بڈی' کے بجائے لڑکے کرکٹ کی گیند سے پٹن پٹائی کھیل رہے تھے کہ اچانک بچل بیچ میں کود پڑا، مجھے بھی ساتھ کھلاؤ۔ لڑکے تیار نہیں تھے۔

''مجھے بھی کھلاؤ، ورنہ.....!'' ایک لڑکے نے غصے سے پوچھا۔

''ورنہ میں.....!'' بچل نے جھپٹ کے گیند چھین لی۔ لڑکے واویلا کرنے لگے۔ اسی وقت میں گھر سے باہر نکلا۔ لڑکے بھاگے بھاگے میرے پاس آئے۔ ''دیکھئے چھوٹے شاہ جی، یہ ہمیں تنگ کر رہا ہے، بچل کا بچہ!''

''کیا بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

بچل نے ہماری گیند چھین لی ہے.....؟'' لڑکے چلائے۔

میں نے بچل کی طرف دیکھا۔ وہ بدمعاشی سے ہنس رہا تھا۔ ''میں نے تو نہیں لی.....!'' وہ بولا، چاہے میری تلاشی لے لو!''

کچھ دنوں سے اس نے شلوار کے بجائے نیکر پہننا شروع کر دیا تھا اور اس وقت اس کے اندر سے اسکی بڑی بڑی ٹانگیں باہر نکلیں اس کے نڈر اور بے باک وجود کا اعلان کر رہی تھیں۔

''چاہو تو.....'' بچل نے لڑکوں سے کہا۔ ''میری جیبیں دیکھ لو!'' وہ مسکرا رہا تھا۔ میں نے ایک لڑکے کو اشارہ کیا۔ وہ آگے بڑھا اور اس نے بچل کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھر جھٹکے سے کھینچ لیا۔ اس کا منہ فق ہو گیا تھا۔ وہ منہ بسورنے لگا۔

''کیوں..... کیا ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

لڑکے نے کوئی جواب نہیں دیا اور روتا ہوا اپنے گھر چلا گیا۔ ایک دم سے سنّاٹا چھا گیا۔ میں نے ڈانٹ کے بچل سے پوچھا..... ''آخر بات کیا ہے، تم نے کیا کیا ہے؟''

''کچھ نہیں جی.....'' بچل ہنس پڑا، ''میں نے تو کچھ نہیں کیا!''

''پھر وہ لڑکا.....؟''

''جی وہ.....!'' بچل دھیرے سے بولا..... ''اصل میں مجھے یاد نہیں رہا چھوٹے شاہ جی کہ نیکر کی جیب پھٹی ہوئی ہے!''

''اچھا تو.....!'' میں نے سائیکل کی رفتار پھر بڑھائی اور اس کے قریب جا کے بولا، ''تو نے اب بھی کچھ نہیں کیا، میں تجھے اچھی طرح جانتا ہوں بچل، مجھ سے جھوٹ مت بول، بھئی تو نے تو حد کر دی' اگر ان لوگوں کو پتہ چل جاتا تو سارے گوٹھ والے کلھاڑیاں لے کر ہم پر ٹوٹ پڑتے تجھے ڈر بھی نہیں لگا بچل، دن دہاڑے؟''

''ڈر.....؟'' بچل دور خلاء میں گھورتے ہوئے بولا..... ''لگا تھا ڈر مگر اس نے سارا ڈر نکال دیا۔ اس نے مجھے اپنے سے لپٹا کے جب میرے گال پر چٹکی بھری تو میرا سارا ڈر جیسے اسکی دو انگلیوں میں سمٹ کے رہ گیا، اور یہ کہ.....!''

''آج ہم پہلی بار ہی تو اتنے قریب آئے تھے ورنہ ہمیشہ تو وہ اس کے ساتھ رہتا تھا!''

''وہ کون؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے وہی.....'' بچل نے کہا..... ''آپ نے نہیں دیکھا اس چھوکرے کو جو ہر وقت سائے کی طرح اس کے ساتھ چمٹا رہتا ہے، کھیتوں میں بھی اور اینٹوں کے بھٹے پر بھی اس کی پہرے داری کرتا ہے!''

''اچھا ہاں.....!'' میں نے ذہن پر زور ڈالا، ''وہ بھولا بھالا چھوٹا لڑکا؟''

''ہاں وہی.....!'' بچل نے جواب دیا، ''وہی، پھلی کہتی ہے، اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ اسے اینٹوں کے بھٹے میں جھونک دے تاکہ اچھی طرح پک جائے!''

''مگر ہے کون وہ بھلا، اس کا بھائی؟'' میں نے پوچھا۔

''بھائی.....'' بچل ہنسا، ''وہ مٹرس ہے اس کا۔ چھوٹے شاہ جی، اسکا خاوند!'' وہ سائیکل پر جھک گیا اور تیزی سے پیڈل چلانے لگا۔

میں نے پلٹ کے دیکھا۔ بیل گاڑی سست رفتاری سے ہمارے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی جس پر بٹائی کی فصل لدی ہوئی تھی۔

◆◆◆

چھلاوہ

عطیہ سید

میں لان میں آنکھیں بند کیے دھوپ سینک رہی تھی۔ میری پشت سورج کی طرف تھی کہ چہرہ تمازت کی زد میں نہ آئے۔ یکا یک احساس ہوا کہ میرے اور سورج کے بیچ کوئی حائل ہے اور میرے اردگرد بکھری ہوئی آرام دہ حدّت ختم ہوگئی ہے۔ سردی کی لہر سی میرے بدن میں دوڑ گئی۔ میں نے آنکھیں کھول دیں اور پلٹ کر دیکھا تو سورج کی چندھیا دینے والی روشنی میں ایک لمبا پتلا وجود دکھائی دیا جس کے چہرے کے نقوش واضح نہ تھے۔

''تم کون ہو؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''میں..... میں سکینہ ہوں''

''یہ کیسے گھر کے اندر آ گئی،'' میں نے دل ہی دل میں سوچا۔ ''غالباً سائیڈ گیٹ کھلا ہے۔''

''مجھے پتہ چلا ہے، یہاں نوکرانی کی ضرورت ہے۔''

''ہاں۔ ہے تو..... مگر تمہارا کنبہ کتنا بڑا ہے۔ میرا مطلب ہے تم کتنے جی ہو؟''

''میں اکیلی ہوں۔''

یہ کہہ کر وہ عجیب انداز میں ہنسی۔

''کیا مطلب؟ کیا تمہاری شادی نہیں ہوئی یا بیوہ ہو یا طلاق ہوگئی۔''

''شادی..... ہوئی تھی۔ خاوند فوت ہوگیا اور اولاد بھی نہیں ہوئی۔''

''تمہاری ضمانت کون دے گا؟''

''کوٹھی نمبر 24 کے کوارٹر میں رہنے والی اماں زینب۔''

میں سوچ میں پڑ گئی۔

''اچھا۔ دو دن بعد آنا..... میں اپنے میاں سے مشورہ کرلوں۔''

اتنے میں میرے پاؤں میں جلن سی محسوس ہوئی۔ میں جھک کے پاؤں کھجلانے لگی..... شاید چند سیکنڈ کے لیے جس کے

بعد سر اٹھا کر دیکھا کہ باقی باتیں بھی سکینہ سے طے کرلوں، لیکن وہ چھلاوے کی طرح غائب ہو چکی تھی۔

دو دن گذر گئے۔ میں باورچی خانے میں پیاز کاٹ رہی تھی اور میری پیٹھ دروازے کی جانب تھی۔ اچانک یوں محسوس ہوا کہ کوئی میرے پیچھے کھڑا میری نقل و حرکت کا جائزہ لے رہا ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک دراز قد دبلی پتلی عورت میلے کچیلے کپڑوں میں کھڑی تھی..... رنگ گاڑھا سانولا، ماتھے پر نمایاں داغ اور بڑی بڑی آنکھیں جن میں للکار سی تھی۔ اس کی شلوار ٹخنوں سے اوپر تھی اور پاؤں..... یارب!..... بہت ہی کریہہ المنظر، قد کے حساب سے بہت چھوٹے، چوکور انگوٹھے لیکن جسامت میں بڑے، البتہ انگلیاں..... باریک اور مہین..... بہت چھوٹی چھوٹی۔ وہ پاؤں اصلی نہیں لگ رہے تھے، بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے سفید کاغذ پر دھبوں سے بنے نقوش پا۔ مجھے جھرجھری سی محسوس ہوئی۔

''ہاں، بھئی! کون ہو تم؟''

''تو بھول گئی، باجی!'' ساتھ میں بے سری سی ہنسی۔

''بدتمیز!''، میں نے سوچا، مگر بآواز بلند صرف یہ کہا۔ ''ہاں۔ مجھے یاد نہیں۔''

''میں سکینہ ہوں۔ دو دن پہلے آئی تھی تو تُو نے بولا تھا کہ تجھے کام کے لیے رکھ لوں گی..... میاں سے مشورہ کرلوں۔''

یہ تُو تڑاں سُن کر مجھے یہ عورت، جو کوئی بھی تھی، ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھی..... لیکن..... میں نے اپنی خوبصورت لمبی مخروطی انگلیوں اور گلابی ناخنوں کی طرف دیکھا جن میں ملازمہ کے چلے جانے کے بعد پیاز، لہسن اور مصالحوں کی خوشبو کہیں یا بو..... بس کر رہ گئی تھی۔

کئی قسم کے خوشبودار ہینڈ لوشن آزمائے، مگر یہ کم بخت باس ایسی بسی..... ایسی رچی کہ جانے کا نام نہیں لیتی تھی۔ نعیم کو اس سے چڑ تھی۔ انگلیوں کی پوریں اور ہاتھوں کی سفید ملائم جلد بھی تباہ ہو رہی تھی..... اور ان ہاتھوں پہ تو نعیم فدا تھے۔ ''اس حسن کو بھی تو محفوظ رکھنا ہے..... نعیم کے لیے..... اپنے لیے۔'' سو دفع کرو اپنی پسند و ناپسند..... کیا ہوا اگر سکینہ مجھے نہیں بھاتی..... کم از کم میں سبزی پیاز اور لہسن چھیلنے کے عذاب سے تو بچ جاؤں گی۔

میں نے یہ سب کچھ سوچ کر سکینہ کو ملازمہ رکھنے کا فیصلہ کرلیا۔

''ٹھیک ہے۔ آ جاؤ کل سے کام کے لیے۔''

''کل سے کیوں؟ آج سے..... بلکہ ابھی سے..... فوراً۔''

میں حیران ہوئی..... حسب معمول، کیوں کہ پہلے دن ہی سے وہ مجھے حیرانی بلکہ بعض دفعہ، پریشانی میں مبتلا کر رہی تھی۔

''کیا تم اپنا سامان نہیں لاؤ گی اور اسے لانے کے لیے وقت نہیں چاہیے؟''

''سامان..... میرا سامان کہاں! بستر تُو دے دینا۔ کپڑے جو تن پر ہیں، کافی ہیں۔''

''کیا مطلب؟ تمہارے پاس صرف ایک جوڑا کپڑے ہیں؟''

''ہاں۔'' ساتھ میں پھر وہی بے معنی ہنسی۔

''اتنی غربت!'' میں پگھل سی گئی۔ ''کوئی بات نہیں۔ کل پرسوں تک میں تمہارے لیے دو تین سوٹ اپنے کپڑوں سے تلاش کر رکھوں گی۔''

''وہ تیری مرضی، ورنہ مجھے تو ایک جوڑا ہی بہت ہے۔''

بدتمیز..... نہ تشکر نہ شکریہ..... الٹا انا کا مظاہرہ..... لیکن..... اس بدتہذیبی کے بعد وہ کٹا کٹ پیاز کاٹنے لگی، اور میرے ریشمی ہاتھوں کی بچت کا امکان روشن ہو گیا۔ سو میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتے ہوئے اپنے بیڈ روم سے ملحق غسلخانے گئی اور ہاتھ رگڑ رگڑ کر دھونے لگی۔

شام ہوئی، نعیم آئے، تھکے ہارے، سیدھے بیڈ روم میں چلے گئے اور بستر پر ڈھیر ہو گئے۔

''آج میں نے رکھ لیا ہے اسے۔''

''کسے؟''

''ایک نوکرانی ہے۔''

''اچھا کیا۔'' نعیم نے عدم دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔

وہ ہمیشہ ایسا ہی کرتے تھے۔ انہیں گھریلو انتظامات سے رَتی بھر دلچسپی نہیں تھی..... شکر ہے مجھ سے تو تھی..... ورنہ..... کیا ہوتا!

تھوڑی دیر بعد نعیم بولے، ''ارے! وہ تم اپنی..... اس سے کہو نا''

''اپنی؟ کِس سے؟''

''اپنی نئی نوکرانی سے۔ ایک پیالی چائے بنا دے۔''

''میں نے سکینہ کو کہا اور وہ چائے بنا کر لے آئی۔ نعیم آنکھیں بند کیے پلنگ پر لیٹے تھے۔

''پیالی بیڈ سائیڈ ٹیبل پر رکھ دو۔''

''اف، میرے خدا! یہ صورت..... اور اس پر نخرہ۔'' میں سکینہ کے چلے جانے کے بعد بڑبڑائی۔

''منہ ہی منہ میں کیا کہہ رہی ہو؟'' نعیم نے پیالی میز سے اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''آپ نے دیکھا نہیں..... کس طرح اٹھلا رہی تھی۔''

''کون؟''

''سکینہ.....نئی نوکرانی.....اور کون۔''

''نہیں۔ میں نے نہیں دیکھا۔ میں آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔''

''بہت بدصورت عورت ہے.....اور آپ اس کے پاؤں دیکھیں تو دنگ رہ جائیں۔''

''کیوں؟ کیا بہت خوبصورت ہیں؟''

''میں جل بھن گئی۔''آپ بھی حد کرتے ہیں پاؤں اتنے عجیب ہیں.....کہ اللہ میری توبہ۔ آپ دیکھیں تو۔''

''دیکھ لیں گے.....اسے بھی اور اس کے پاؤں بھی۔''

''کیا مطلب.....دیکھ لیں گے اسے بھی۔''میں چڑ کر بولی۔

''ارے! یار! کوئی مطلب نہیں۔ میں نے صرف یہ کہا ہے کہ گھر میں کام کرے گی تو خود بخود دکھائی دے گی اس کی ہئیت کذائی۔''

نعیم نے مجھے ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا، مگر میرے اندر کہیں رقابت کسمسانے لگی۔

اگلے دن میں نے سکینہ کو دال بنانے کے لیے کہا۔

''کون سی؟''اس نے آنکھیں نچاتے ہوئے پوچھا۔

مجھے اس کی بڑی بڑی آنکھوں اور ان میں تھرکتی نخریلی گستاخی سے چڑ سی ہونے لگی تھی۔

''مَسُور کی۔''میں نے جواب دیا اور ساتھ ہی ساتھ دل میں اس جملے کا اضافہ کیا،''یہ منہ اور مسور کی دال۔''

میں لاؤنج میں کشن ٹھیک کر کے صوفوں پر رکھ رہی تھی، لیکن مجھے باورچی خانے میں کھڑی سکینہ صاف دکھائی دے رہی تھی، کیوں کہ باورچی خانے کا ایک دروازہ لاؤنج میں کھلتا تھا۔

سکینہ نے دال صاف کیے بغیر پانی سے بھری دیگچی میں ڈال دی۔ میں نے کشن صوفے پر پھینکے اور باورچی خانے کی طرف لپکی۔

''ارے، ارے! یہ کیا کر رہی ہو!''

''اوہو! باجی! تو نے ہی کہا تھا کہ مسور کی دال بنا دے۔''

''تو کیا دال دھوئے بغیر ہی بنا دیتے ہیں؟''میں اپنے غصّے کو دبانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

''مگر یہ تو مسور کی دال ہے۔''وہ ڈھٹائی پر اتر آئی۔

''جَھلّی! دال مسور کی ہو یا ماش کی.....ہر قسم کی دال دھونے اور صاف کرنے کے بعد بنائی جاتی ہے۔''

''کیوں؟''

میرا جی چاہ کہ اسے ایک چپت رسید کروں اور کہوں..... بیوقوف عورت! حفظانِ صحت کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے.....لیکن حفظان صحت کو یہ ان پڑھ جاہل کیا سمجھے گی؟ لہٰذا میں اپنی ناراضگی کا اظہار کیے بغیر اسے سمجھانے کی کوشش کرنے لگی۔

''دانوں میں مٹی ہوتی ہے۔ بے شک یہ پیکٹ میں بند ہوں۔ دھلنے سے صاف ہوجاتی ہیں، ورنہ پیٹ میں گڑ بڑ ہوجاتی ہے۔''

''پیٹ میں گڑ بڑ.....! وہ تو کبھی نہیں ہوئی۔ جس نے بھی میرے ہاتھ کی بنی ہوئی دال کھائی.....بھلا چنگا رہا۔ سارے گاؤں میں میرے ہاتھ کی بنی ہوئی دال کی دھوم تھی۔''

''اچھا،'' میں نے طنزاً پوچھا،''تو تم گویا دال بنانے میں قومی شہرت رکھتی ہو۔''

''وہ کیا ہوتا ہے، باجی؟''

''کچھ نہیں ہوتا۔ اپنا کام کرو۔ دال کو دیگچی میں سے نکالو اور صفائی دھلائی کے بعد چولہے پر چڑھا دو۔''

جوں جوں دن گذرتے گئے میری تلملاہٹ میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ سکینہ بات بے بات اپنی تعریف کا پہلو نکالتی۔ اس جیسا تو نہ کوئی کھانے بنانے میں ماہر تھا، نہ کڑھائی سلائی میں۔ کروشیے میں تو کوئی اس کا ثانی نہیں تھا۔ بڑی بڑی بیگمیں اس کے در پر چل کر آتی تھیں کہ تارکش کروانے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اُف میرے خدا! عورت ہے کہ انا کی پتلی۔ میں نے کسی غریب طبقے کی عورت میں اتنی خود پرستی اور انا نہیں دیکھی تھی۔ اس پر طرّہ یہ کہ وہ اپنے آپ کو قالۂ عالم بھی سمجھتی تھی۔ اس نے لفظوں میں کھل کر اس کا اظہار تو نہیں کیا تھا، لیکن ناز نخرہ، عشوہ وادا، مردوں کے سامنے اٹھلانا لہرانا اور اٹک مٹک .....سب اس بات کے غمّاز تھے کہ اسے اپنی جنسی کشش پر مان تھا.....اور غالباً وہ اسے بارہا آزما بھی چکی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس کی بعض حرکات پراسرار سی تھیں یا پھر..... مجھے وہ پراسرار سی محسوس ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا جیسے کوئی میرے پیچھے کھڑا ہو۔ میں پلٹ کر دیکھتی تو وہاں کسی کو نہ پاتی۔ لیکن بعض اوقات وہ خاموشی سے دبے پاؤں چلتی ہوئی آتی اور عین میری پشت پر بے حس وحرکت کھڑی ہوجاتی اور اکثر میں اس کی موجودگی سے بے خبر ہوتی۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ جب میں کسی کام میں مصروف ہوتی یا اپنے خیال میں گم تو وہ بڑے غور سے میرا جائزہ لیتی تھی۔

ہمارے شہر کا مختصر سا موسم سرما گذر گیا۔ گرمیاں سر پر تھیں۔ میں نے ائیر کنڈیشنر کی سروس کا سوچا۔ ایک الیکٹریشن تھا.....اسلم.....اچھے مزاج کا اور اپنے کام میں ماہر۔ میں نے اسے بلا بھیجا۔

اسلم وعدے کے مطابق آیا اور گھر کے پچھلے صحن میں ائیر کنڈیشنر کی سروس شروع کردی۔ میں لاؤنج میں بیٹھی تازہ اخبار کی سرخیوں پر سرسری سی نظر دوڑا رہی تھی۔ اسلم نے اے۔سی کی صفائی کے لیے سرف مانگا۔ میں نے سکینہ کو آواز دی کہ باہر اسے سرف دے آئے۔ وہ لہراتی اٹھلاتی سرف لے کر باہر چلی گئی۔

پندرہ بیس منٹ گذر گئے اور سکینہ واپس نہ آئی۔ میرا ذہن قومی اور بین الاقوامی مسائل سے ہٹ کر واپس گھریلو مسائل کی طرف لوٹ آیا۔

''سکینہ واپس نہیں آئی.....ابھی تک۔''

یوں لگتا تھا جیسے وہ پچھلے صحن کے بجائے دو بلاک پرے گئی ہوئی تھی۔

دس منٹ اور گذر گئے۔ میرے اندر تناؤ کے آثار پیدا ہونے لگے تھے کہ اچانک ایک چیخ فضا میں ابھری۔ میں گھبرا کر پچھلے صحن کی طرف بھاگی، کیوں کہ چیخ ادھر ہی سے بلند ہوئی تھی۔

جب میں نے پچھلے صحن میں کھڑکی سے جھانکا تو اسلم اے سی کے سامنے کھڑا تھا اور پائپ نلکے سے جڑا ہوا تھا۔ اسلّم ہکّا بکّا تھا اور پانی کے ربر پائپ کا رخ سکینہ کی طرف تھا۔ وہ اس کی زد میں تھی، کپڑے بھیگے ہوئے تھے اور وہ پانی کے ریلے کے سامنے اٹھلا اٹھلا کے پہلو بدل رہی تھی، ساتھ ہی اس کی آنکھیں کسی انجانی لذّت سے دہک رہی تھیں.....اور اسلم..... بیچارہ مبہوت، بت بنا سکتے کے عالم میں تھا۔ لیکن وہ بھی پانی کا رخ موڑنے پہ آمادہ نہیں دکھائی دیتا تھا۔ دامنِ یوسف تار تار تھا اور زلیخا بآواز بلند اعلان کر رہی تھی کہ یوسف نہیں.....وہ خود کشتہ تیغ ستم تھی۔

اس دن کے بعد سے میرے دل میں سکینہ کے بارے میں شکوک جڑ پکڑنے لگے۔ میں اس کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھنے لگی۔ گرمی کی لمبی دوپہروں میں وہ کام کاج ختم کر کے کوارٹر میں چلی جاتی۔ کبھی کبھار کوارٹر سے ہنسی سنائی دیتی۔ میں حیران ہوتی کہ وہاں کون ہے.....سکینہ تو اکیلی تھی۔ میں کوارٹر کا دروازہ کھٹکھٹاتی اور سکینہ سے پوچھتی۔

''یہاں تمہارے ساتھ کون ہے؟''

''کوئی بھی نہیں۔''

''تم ابھی ابھی ہنس رہی تھی۔''

''خود اکیلے میں ہنس رہی تھی۔''

''کیا کوئی خود اکیلے میں بغیر کسی دوسرے کی موجودگی کے ہنس سکتا ہے؟''

میں اسے مشکوک نظروں سے دیکھتی اور وہ گستاخ نگاہوں سے مجھے گھورتی رہتی۔ عموماً گیٹ کی گھنٹی بجتی تو سکینہ غائب ہو جاتی۔ جب کافی دیر تک واپس نہ آتی تو میں ڈیوڑھی کے دروازے سے جھانکتی کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ وہ سائیڈ گیٹ کھولے کسی نہ کسی مرد سے خوش گپیوں میں مصروف ہوتی۔ خیر غیروں کی تو کیا پرواہ تھی، ہنستی تھی تو ہنستی رہے۔ لیکن جب وہ میرے نعیم کے گرد چمگادڑ کی طرح منڈلانے لگتی تو میں خائف ہو جاتی۔ وہ آتے تو بہانے سے بیڈروم میں پہنچ جاتی۔ کبھی ان کے بوٹ اتارتی، کبھی ان کا کوٹ اتارنے میں مدد کرتی۔ کبھی ان سے پوچھتی۔

''صاحب جی! چائے لے آؤں.....گرما گرم.....ایک پیالی۔''

کبھی کہتی،''دودھ پی لو صاحب.....ایک گلاس.....اتنا کام کر کے آیا ہے.....طاقت آ جائے گی بدن میں۔''

کبھی سکنجبین کی پیشکش ہوتی اور کبھی خشخاش کے شربت کی دعوت۔

ایک دن تو بات حد سے بڑھ گئی اور میرے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا میں بازار خرید و فروخت کے لیے گئی، لوٹی تو سکینہ کو نعیم کے پاؤں دبانے کے بہانے بستر پر پایا.....اور وہ بھی میرا کڑھائی والا دوپٹہ اوڑھے ہوئے۔

میں آپے سے باہر ہو گئی، اسے بے نقط سنائیں اور فوراً دوپٹہ اتارنے کا حکم دیا۔

''ارے! تم دوپٹے کے لیے کیوں پریشان ہو گئیں۔ میں تمہیں ایسا ہی نیا دوپٹہ لا دوں گا۔ یہ تو گھس پٹ چکا ہے۔''نعیم بیچ میں کود پڑے۔

یہ سن کر میرے تن بدن میں آگ لگ گئی۔''ارے تو بروٹس.....نعیم! تم بھی اس کی طرف داری کر رہے ہو! بس، اب تو اسے ایک منٹ بھی گھر میں رہنے یا ملازمت میں رکھنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ چل نا ہنجار! حرافہ! ابھی اور اسی وقت نکل جا میرے گھر سے۔''

یوں میں نے کھڑے کھڑے سکینہ کو گھر سے نکال دیا۔ مگر سارا دن طبعیت بوجھل اور بدمزہ رہی۔ کوئی انجانی پرچھائیں سی تھی.....مجھ پر، گھر کی ساری فضا پر.....حتیٰ کہ نعیم بھی اس کی زد میں تھے۔

مجھے اس رات بارہ بجے تک گہری نیند نہیں آئی.....بس سوتے جاگتے کی کیفیت تھی۔ اسی کیفیت میں مجھے اپنے بیڈروم کا دروازہ کھلنے کا احساس ہوا۔ دیکھا تو سکینہ کھلے دروازے میں تصویر بنی کھڑی تھی۔

''یہ کیسے گھر میں داخل ہوئی؟''میں نے سوچا،''میں نے تو دس بجے رات خود تمام دروازے مقفل کیے تھے۔''

سکینہ ہمارے پلنگ کی طرف بڑھی اور میرے برابر میں لیٹے نعیم کے سینے پر سوار ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کا چھائیوں بھرا چہرہ کندن ہوا، نین کنول ہوئے، ہاتھ نعیم کے چہرے کی طرف بڑھے اور وہ اس کے لبوں کا بوسہ لینے یا دینے کے لیے جھکی۔

''اے میرے مولا! یہ چھل ہے.....سپنا ہے.....یا حقیقت؟''

میرا وجود کسی نامعلوم خوف کی لپیٹ میں تھا۔ مگر میں نے اپنی تمام تر قوّتِ ارادی کو جمع کرتے ہوئے جست لگائی اور نعیم کے جسم کو سکینہ کے پنجے سے آزاد کروانے کی کوشش میں اس سے گتھم گتھا ہو گئی۔

سکینہ میں جنون کی قوت تھی، لیکن میں بالآخر اسے پلنگ سے نیچے پھینکنے میں کامیاب ہو گئی۔ جانے یہ کامیابی نعیم کی چاہت تھی یا اس اسمِ پاک کا معجزہ جو میرے لبوں پر تھا.....معلوم نہیں۔

سکینہ فرش پر گری، لیکن پل بھر میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں وحشت ناک تھیں اور چہرے پر خباثت

تھی۔

وہ اٹھلاتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔ میں نے اس کا پیچھا کیا۔ وہ ڈیوڑھی سے گذر کر پورچ میں پہنچ گئی۔ اس نے پلٹ کر میری جانب دیکھا تو میں اس کے حسن کی تاب نہ لاسکی۔ اس پر اس نے خوفناک قہقہہ لگایا اور لچکتی کمر، مٹکتے کولہوں کے ساتھ گیٹ کی طرف بڑھی۔

اف میرے خدا! یہ میں کیا دیکھ رہی ہوں..... وہ خود تو آگے کی طرف جارہی تھی..... لیکن اس کے پاؤں پیچھے کی طرف مڑے ہوئے تھے۔ ایک گھڑی میں اس کا وجود اندھیروں میں گم ہوگیا۔

میں دم بخود تھی۔

میں نے نعیم کی طرف دیکھا..... وہ میرے برابر میں بے خبر پرسکون سو رہے تھے۔

◆◆◆

''تخلیق'' راولپنڈی میں مندرجہ ذیل مقامات پر دستیاب ہوگا

ورائٹی بکس سٹال

ورائٹی بکس، بنک روڈ، صدر۔ راولپنڈی (فون : 051-5583397)

سمائل بکس ڈپو

200-B، لالہ رُخ، واہ کینٹ۔ راولپنڈی (فون: 051-4532598)

اشرف بُک ایجنسی

کمیٹی چوک، اقبال روڈ۔ راولپنڈی (فون: 051-5531610)

پڑاؤ

بشریٰ اعجاز

لون کے ڈیزائنز کے جوڑے، کڑھائیاں، لیس کے فارمل سوٹ، اوران کی سلائی، یہ تھیں ہم ماں بیٹیوں کی باتیں، جو پچھلے ایک گھنٹے سے چل رہی تھیں، نیم گرم ماحول، ہنسی کے فوارے، خوشبودار گلابی چائے، بوندی کے لڈو، سفید کنڈیارے، جنھیں رڑکتے ہوئے چائے کے چھوٹے چھوٹے سِپ بھی لیے جارہے تھے، ٹی وی ڈراموں پر تبصرے بھی ہورہے تھے، اورنئی خریداری پر اظہار خیال بھی چل رہا تھا، کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی، بڑی نحوست ہے یہ موبائیل، جب سے زندگیوں میں داخل ہوا ہے۔ جو تھوڑی بہت آزادی تھی، وہ بھی گئی۔ جہاں بھی چلے جاؤ، سب کی دسترس میں ہوتے ہیں، کہیں سکون اورفراغت نہیں۔ پرس سے فون ڈھونڈتے ہوئے، میں باقاعدہ خبطی عورتوں کی طرح بڑبڑارہی تھی، اورفون تھا کہ پرس کے کنوئیں جیسے پیٹ کی کسی ایسی تہہ میں اتر چکا تھا، کہ ابھرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا،.....اور.....اوپر سے یہ منحوس، پرسوں کے نام پر، جناتی تھیلے، عمروعیار کی زنبیلیں، ایمرجنسی میں کوئی چیز نکالنی پڑجائے، تو مصیبت آجاتی ہے، مجھے تو ان کے پیٹ بھی پاکستانی سیاست دانوں جیسے لگتے ہیں، جتنا ڈالو، لکڑہضم، پتھرہضم، سب کچھ ڈکارتے چلے جاتے ہیں نامراد! میری جھنجھلاہٹ اب بڑھتی جارہی تھی، اورفون تھا، کہ مل نہیں رہا تھا، اورنہ ہی اس کی گھنٹی بند ہورہی تھی، نجانے کون مصیبت کا مارا ہے، جو اتنا لمبا انتظار کرے جارہا ہے.....ہوگا، آپ کا کوئی پنکھا..... یا پنکھی! Butteror، لسوڑے کی لیس، محترمہ آپ کا کالم.....محترمہ آپ کی نظمیں.....محترمہ آپ کی کہانیاں! ایک تو ان خوشامدیوں نے ہماری اماں کا مغز چاٹ رکھا ہے، بڑبولی ثوبیہ (بیٹی) مجھے چڑانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہ جاتے دیتی تھی، اس نے جھپٹ کر، مجھ سے پرس لیا، اورفون جو، اب بجتے بجتے تقریباً نڈھال ہوچکا تھا' اسے ایک سیکنڈ میں نکال کر، میرے ہاتھ پر رکھ دیا! یہ لیں..... یہ تو حال ہے آپ کا، اپنے پرس میں رکھی چیز بھی آپ کو نہیں ملتی، کیسے ملے، اس میں تمہارے جیسی جاسوسی Qualities ہوں تو پھر ہے نہ، میری جگہ سبنیا نے ہنستے ہوئے جواب دیا، اور میں نے فون کی اسکرین پر نگاہ کی، قاری فیض کا نمبر تھا، ''قاری صاحب ہیں'' کہتے ہوئے میں نے لیس دبایا.....مگر آگے سے فیض کے بجائے، ایک رندھی ہوئی نحیف ٹکڑوں میں بٹی ہوئی آواز ابھری! ''پھپھو جی! میں قاری صاحب کی بیٹی بول رہی ہوں!'' خیریت تو ہے بیٹا؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا.....''پھپھو جی.....قاری صاحب.....فوت ہوگئے ہیں''.....''کب؟.....کیسے.....؟'' اوہ خدایا، ناگہانی خبروں کا عموماً یہی

فوری ردِعمل ہوا کرتا ہے، مگر اس کے بعد، کال بند ہونے، سامان سمیٹنے، گھر آنے اور آنے کے بعد، پیچھے دور تک مڑ کر دیکھنے کے دوران جو گزری، وہ کچھ کم نہ تھی..... ماضی میں جھانکنا اور اپنے درمیان موجود لوگوں کی دائمی غیر موجودگی تسلیم کرنا کچھ آسان ہے کیا.....؟ یاد آیا.....اور پھر کیا کیا نہ یاد آیا!

.....

ان دنوں گاؤں کے بچوں کی دلچسپی کا بڑا مرکز، چاچے نورے موچی کا گھر تھا، جس کے گھر والوں نے دور، مری کے پہاڑوں سے، کریہہ شکلوں کے لمبی لمبی ٹانگوں والے، بہت سے پہاڑی کیڑے پکڑ کر، مرغیوں کے ٹوکرے کے نیچے بند کیے ہوئے تھے، ان کیڑوں کی جسامت، کم وبیش مرغی کے انڈے سے تازہ نکلے چوزے جتنی تھی، ماسی گُلّاں، ٹوکرے کے نیچے ہاتھ ڈال کر، روزانہ ان میں سے ایک کیڑا پکڑتی، اور سوڑ (روسٹ) کر کے، منجی پر پڑے، چاچے نورے کو کھلا دیتی، شنید تھی کہ یہ کیڑے، منڈی پھلران کے ایک بہت بڑے طبیب نے، جو بھیرے کے مشہور طبیب گھرانے ''شاہ پوریوں'' کی لڑی سے تھے، بغرضِ علاج تجویز کیے تھے، گنٹھیا اور ٹی بی کے مہلک امراض کیلئے۔ جن کی آج سے چالیس برس قبل، کوئی مؤثر دوا ایجاد نہ ہوئی تھی، چاچا نورا ان امراض کا عرصۂ دراز سے شکار تھا، اور چارپائی پر، پڑا، پڑا، اب وہ چاچا نورا نہیں، محض ایک پنجر بن کر رہ گیا تھا۔ دور سے دیکھنے پر جس کی آنکھوں کی سفید سفید پتلیاں گھومتیں، اور سینے کی پسلیاں، تکلیف دہ سانسوں کی دھونکنی چھوڑتیں، تو اندازہ ہوتا، پنجر میں جان باقی ہے۔ جبکہ اس کے برعکس، وہ خوفناک اور کریہہ پہاڑی کیڑے، اس قدر زندگی کی حرارت سے بھرے ہوتے تھے کہ ہر وقت ٹوکرے کے نیچے اودھم مچائے رکھتے، کبھی کبھار غلطی سے ٹوکرے کو ٹھوکر لگ جاتی، اور وہ الٹ جاتا تو ان کیڑوں کے بھاگنے کی رفتار دیکھنے والی ہوتی، گاؤں کے بچے ہُش ہُش کرتے، ان کے پیچھے لگ جاتے اور درختوں، دیواروں اور گھر کے کونوں کھدروں سے انہیں برآمد کر کے لاتے اور ٹوکرے تلے گھسیڑ دیتے۔ یہ ایسی ایکٹیویٹی تھی، جو شرارتی بچوں کے لئے تو ایک دلچسپ کھیل جیسی تھی، مگر دیگران کیلئے اچھی خاصی دہشت ناک تھی۔

15 سال فیض، غریبی اور بیماری سے لڑتا باپ سے، چمڑا رنگنا، کاتنا اور اس پر تلہ چڑھانا سیکھ کر، اب آہستہ آہستہ ہلکی پھلکی سادہ جوتیاں سی رہا تھا، پرانے سیپی واپس آ رہے تھے۔ نورا دُکھے دل سے یہ سب کچھ دیکھتا رہتا جس کی ہنرمندی کی علاقے میں چرچا تھی اور جس کی سِلی ہوئی جوتی، راٹھ زمینداروں کی بہو بیٹیوں کے جہیز اور بری کا سنگھار ہوتی تھی، اپنی نزاکت، خوبصورتی اور تلے کی انوکھی جڑت کے باعث، اپنی الگ ہی مشہوری رکھتی تھی۔ یہی وجہ اسے ہر وقت علاقے کے اعلیٰ گھرانوں سے بلاوے آتے رہتے اور وہ بیبیوں کے پاؤں سفید ڈوری سے ماپ کر اُن کی نازک اور نفیس جوتیاں تیار کر کے بروقت دیتا رہتا، اور انعام میں اناج کے علاوہ، نقدی اور ریشمی کپڑے بھی سمیٹتا رہتا۔ اس کے ہاتھ میں ہنر کا چانن تھا، اور دل میں خلوص۔ سارا وقت کام کے دوران کلمے شریف کا ورد اس کی زبان پر رہتا، چمڑا کاتنے، جوڑنے اور سینے کے دوران وہ گردوپیش سے بےخبر ہو جاتا، اس زمانے میں چاچے نورے کے گھر میں ہن برستا تھا۔ ماسی گُلّاں، لیڈی ہملٹن اور 7330 کے ڈوپٹوں کے علاوہ کہیں ٹھہرتی ہی نہ تھی۔

دوسرے دن ان کے گھر ککڑی ذبح ہوتی، جسکی ''بھونی'' کی خوشبو، پورے ویہڑے میں پھیل جاتی۔ جہاں ماسی گُلّاں اور چاچے نورے کا پیکا سوہراٹبر رہتا تھا۔ دیورانیاں، جٹھانیاں، ایک دوسرے کے کانوں میں سرگوشیاں کرتیں اور دانتوں میں اُنگلیاں داب کر، گُلاں کے نخرے دیکھتیں۔

مگر یہ اب پرانی باتیں تھیں۔ جنہیں دہراتے ہوئے ویہڑے والیاں گُلّاں پر ترس کھاتی رہتیں اور فیض کو دیکھتی رہتیں، جو باپ کی منجی کے پاس منہ اندھیرے دکان لگاتا، تو شام ڈھلے تک، لالٹین کی اندھی روشنی میں، جوتیوں پر تلے جڑتا رہتا۔ پانچ بہن بھائی، بیمار باپ اور لمبی غریبی کے آسیب میں گھرا، وہ کچا کوٹھا، جس کی بھربھری دیواروں پر، کسی تنہا قبر کا گمان ہوتا تھا۔ فیض کو اس سے بہت خوف آتا تھا۔ گھر کا اندھیرا، بھوک سے بلکتے بہن بھائی اور مسلسل کھانستا باپ، جس کے علاج کے لئے مال ڈنگر اور گھر کا سارا ''ٹوم ٹلا'' (زیور) بک چکا تھا۔ روز ماسی گُلاں، گھر کا کوئی برتن بھانڈا ہٹی پر دے کر، بدلے میں ٹوپہ دوٹوپے گندم لے آتی، چکی پر پیستی اور بچوں کو کھلا کر، حیاتی کا ایک اوکھا دیہاڑ پٹا لیتی۔ مگر کب تک؟ جس روز پیتل کی آخری پرات ہٹی پر گئی، اسی رات چاچے نورے کے سینے کے جھکھڑ تھم گئے، اس نے آخری مشکل سانس سے پہلے، گُلاں کا ہاتھ نوعمر فیض کے ہاتھ میں دیا اور دنیا سے رخصت ہو گیا۔ ایک چھوٹی سی جست میں، فیض نوعمری سے بڑھاپے کی منزل کو پہنچ گیا۔ یتیم بہن بھائی اور بیوہ ماں! یہ بوجھ اب چمڑا رنگنے، کاتنے اور جوتیاں سی کر، سیپیوں کا انتظار کرنے سے، نہیں اٹھنے والا، اس بوجھ کو اٹھانے کیلئے نئے حیلے کرنا ہوں گے۔ یہ سوچ آتے ہی آبائی کام ترک کر کے وہ لاہور نکل گیا۔ اگلے چند سال میٹرک، عربی فاضل، ایف اے اور بی اے کے ساتھ ساتھ لاہور کی مساجد میں جمعہ پڑھانا، درس و تدریس میں حصہ لینا اور مغل پورے، بھگوان پورے، اچھرے اور گڑھی شاہو کی مساجد میں، گاہے بگاہے وعظ دینے کا سلسلہ بھی چلتا رہا۔

لہور شہر بہت بڑا تھا، اتنا بڑا کہ فیض کی ٹانگیں سائیکل چلاتے چلاتے ٹوٹنے لگتیں، وہ زور زور سے یاسین شریف پڑھتا، پیڈل مارتا، اچھرے سے مزنگ، مزنگ سے پکی ٹھٹھی، اور وہاں سے گڑھی شاہو اور مغل پورے کے فاصلے طے کرتا رہتا۔ اکثر ان ''اسفار'' کے دوران اسے موچیوں کے ویہڑے میں ڈکراتے جانور، ان کا پٹھ دتھ کرتے، اس کے مامے، چاچے یاد آتے، جو چمڑا منڈی سے چمڑا لانے، دھونے، رنگنے اور کاتنے کے دوران، آپس میں ہنسی مخول بھی کرتے، مونگ پھلیاں اور ریوڑیاں بھی اڑاتے، اور دوپہر میں کورے کُنے کی گاڑھی لسی اور تازہ مکھن کے بڑے بڑے روٹ بھی، پیاز کی چٹنی اور اچار کے ساتھ کھاتے، اضافی انٹرٹینمنٹ کے طور پر، شام کو بچوں کو لِترَ کھپی اور زنانیوں کو دھول دھپے کے ذریعے، بال بچوں پر رعب داری کا نشہ بھی لے لیتے، جتنی دیر دکان پر بیٹھ کر، جوتیاں سیتے، گاہکوں سے بھی گپ شپ اور کڑوے تمباکو کا حقہ بھی چلتا رہتا، جبکہ فیض ادھر لہور میں مذکورہ عیاشیوں کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ فجری ویلے، وہ تتی چائے اور پاپے کھا کر، دن کی ابتدا کرتا، اس کے بعد شہر کے دور دراز، حصوں کے پھیرے لگاتے، ٹریفک کے شور، مٹی، دھواں اور ہارنوں کے درمیان بھوت بنے رہنے کے دوران اسے اتنا ہوش کب ہوتا کہ وہ کہیں ستانے کے لیے ٹھہرے۔ جھٹ کو سانس لے، چلوتنوری پراٹھے اور کُنے کی لسّی نہ سہی، کہیں سے باسی نان چھولے

ہی لے کر کھالے اور نہیں تو سڑک کنارے کھڑے قلفی والے سے جھٹ پٹ قلفی لے کر ہی جون کی جھلستی دوپہروں کو بہلا لے، مگر ایسا کرنا شاید قاری فیض کی کتابوں میں لکھا ہی نہ تھا!

صبح کا نکلا رات پڑے مسجد کے حجرے میں لوٹتا تو کھجور کے پھوڑھ پر بیٹھ کر مسجد میں آنے والے نذر نیاز کے رنگ برنگے سالنوں کا بچا کھچا، ٹھنڈی روٹی سے کھاتے ہوئے ہر روز ایک دفعہ، اسے ضرور، بھوسہ اور گوبر ملی، مٹی سے لیپا، وہ کچا کوٹھا یاد آتا، جس کے ویہڑے کے عین درمیان لگی دھریک کی ٹھنڈی چھاؤں تلے رکھی، بے ڈھنگی گھڑونچی کے گھڑے کا پانی پی کر، دن بھر کی پیاس چشمِ زدن میں ختم ہو جاتی تھی اور کونے میں تنور پر کھڑی ماسی گُلاں، اسے دیکھ کر جلال سے ہاتھ کے پیڑے میں، گھی کا ''ہتھ'' لگا کر، اس کے لیے تھندی (گھی چپڑی) روٹی پکانے لگتی تھی، جسے دیکھ کر دونوں چھوٹیاں شور مچاتیں، اماں ہم نے بھی تھندی روٹی کھانی ہے۔ ''چپ نی، بھرا کی ریس نہیں کرتے، ''انہیں جھڑکتے ہوئے، اماں دوسرے پیڑے کا آٹا، نتون سے نکالتی، فیض ہانک لگاتا، ''اماں جلدی سے روٹی دے دے، بہت بھوک لگی ہے'' اور اماں، لپ جھپ، اس کی روٹی پر ''چونڈی'' مار کر مکھن کا چھوٹا سا پیڑا رکھتی، اس کی طرف لپکتی.....! حجرے کا پرانا پنکھا گھوں گھوں کر کے بمشکل چلتا، اور گاؤں کے ویہڑے میں، پُرے کی ہوا کا عادی فیض، شہری گرم ہوا کے اِکا دُکا جھونکوں کا سینک، پنڈے پر نہیں، براہِ راست روح پر محسوس کرتے ہوئے، پاسے مارتا، بالآخر تھک کر آنکھیں مُوند لیتا۔

''لہور کتنا بڑا ہے فیض؟'' ایک دفعہ ماسی گُلاں نے پوچھا۔ ''اماں! اتنا بڑا ہے کہ مجھے اس سے خوف آتا ہے''..... ''خوف آتا ہے، مگر کیوں؟'' سیدھے دماغ کی ماسی گلاں کو سمجھ نہ آتی، اور وہ بکّی بکّی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ ''پتہ نہیں کیوں.....؟'' وہ بھی ہکا بکا ہو کر سوچنے لگا! بھائیا! ''کیا وہاں چڑیلیں اور جن رہتے ہیں'' دونوں چھوٹیاں، ڈر کر پوچھنے لگیں۔ ''کیوں یہ خیال تمہیں کیسے آیا؟'' بھائیا! ابھی تم کہہ رہے تھے نا تمہیں لہور سے خوف آتا ہے۔ ''بڑی سیانی ہوگئی ہیں یہ دونوں۔ کیوں اماں!''..... ''ان کی بات پر فیض ہنس پڑا۔'' بات یہ ہے پتر! وہاں چڑیلیں اور جن تو نہیں رہتے، مگر ایسا کچھ ضرور ہے، جس سے مجھ جیسے پینڈو کو ڈر لگتا ہے! بھائیا! ہم نے بھی لہور دیکھنا ہے۔ دونوں اس کے دائیں بائیں، اس کے بازو پکڑ کر بیٹھ گئیں۔ ''پراں جاؤنی، بھرا کو تنگ نہ کرو! چِراں بعد آیا ہے۔ چار گھڑی ساہ لینے دو اسے۔'' نہ اماں! انہیں کچھ مت کہا کرو۔ مجھے نہیں کہیں گی تو کسے کہیں گی۔ تو لہور جا کر کچھ زیادہ ملائم نہیں ہو گیا فیض۔ اماں، یہ جو پردیس ہوتے ہیں نہ، یہ دیس کی قدر بڑھا دیتے ہیں۔ پردیسیوں کے دل ہمیشہ دیسوں کے ''ادریویں'' اور اپنوں کی جدائی سے بھیگے رہتے ہیں۔ اور یہاں ہم تیرے لئے، دیس میں بھی دُکھی رہتے ہیں، ماسی گُلاں نے پلّو آنکھوں پر رکھ لیا۔ ہلّا اماں، کوئی ہور گل کر۔ چھڈ یہ دل دکھانے والی باتیں۔ تو بتا، سُگری! تو نے لہور میں کیا دیکھنا ہے۔ میں نے..... چڑیا گھر..... دیکھنا ہے بھائیا! اور میں نے انارکلی بزار دیکھنا ہے، سنولی بھی جلدی سے بولی۔ نی سر جاتے، تم دونوں کا، یہ باتیں تمہیں کون بتاتا رہتا ہے؟ ماسی گلاں، چادر کے پلے سے آنکھیں رگڑتے ہوئے بولی۔ ''ان کا بھائیا''، فیض نے ہنستے ہوئے، جیب سے ٹافیاں نکالیں اور انہیں دیتے ہوئے بولا۔ ''دکھاؤں گا، ضرور دکھاؤں گا۔ جاؤ اب باہر جا کر کھیلو!''

قاری جی! بھگوان پورے کی پتلی گلی کے ایک لمبے چوڑے مکان کے ادھ کھلے دروازے سے آواز آئی، اور فیض کے قدم رُک گئے۔ اس نے کندھے پر پھیلائے چارخانے کے ہلکے گلابی رنگ کے رومال سے پسینہ پونچھا اور پیچھے مڑ کر دیکھا، شام کے نیم اندھیرے، اجالے میں جالی کے سبز دروازے سے پیکو والا گلابی ڈوپٹہ جھلکا، اور اِک مہندی والے سنہری ہاتھ نے اشارے سے اس کا رستہ روک لیا۔ قاری نیچی نگاہوں سے دیکھتا، قدم قدم چلتا دروازے تک آیا ''جی بی بی!''..... ''ایک درخواست ہے جی!''..... فرمائیں بی بی..... ''مجھے قرآن پڑھا دیں''..... آپ کو.....؟ قاری کی جھکی جھکی باادب نگاہ اک پل کو اٹھی، اور اٹھنے سے پہلے ہی پلٹ آئی۔ ''دراصل بات یہ ہے قاری جی! میں بچپن میں قرآن نہ پڑھ سکی۔ یتیم تھی، رشتہ داروں کے گھروں میں رُلتی رہی، شادی ہوئی تو خیال آیا، اوہو..... یہ تو بہت ضروری کام تھا، مگر جھجکتی رہی، لوگ کیا کہیں گے، اس عمر میں قرآن پڑھ رہی ہے۔ ایک دن ڈرتے ڈرتے اپنے گھر والے سے بات کی تو انہوں نے کہا مجھے یہ نیک کام جلدی کر لینا چاہیے۔ ''اچھا جی، اس ساری تقریر کے دوران قاری مکان کی چوکھٹ کے سامنے کھڑا کھڑا، دور سے تاریک صدیوں کا کوئی ایسا کردار لگ رہا تھا، جسے بولنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ''تو پھر..... قاری جی بتائیں؟'' مہندی والے ہاتھ کا اضطراب اور گلابی ڈوپٹے کا پلو بول اُٹھا۔ ''سوچ کر بتاؤں گا''، بھگوان پورے کی پتلی گلی سے قاری نے .....واپسی کے لیے قدم اٹھایا، ''اس میں سوچنے کی کیا بات ہے؟''..... بی بی! میں نے کہا نہ میں سوچ کر''..... ''سوچ لیں، جتنا بھی سوچنا ہے مگر اتنا یاد رہے، مجھے قرآن آپ نے ہی پڑھانا ہے، اگر آپ نہیں پڑھائیں گے تو پھر میں قرآن نہیں پڑھوں گی۔'' آغاز میں کچھ ایسی ضد تھی کہ قاری کانپ اٹھا۔ ''مگر آپ مجھ سے ہی کیوں پڑھنا چاہتی ہیں؟'' قاری کی آواز بمشکل جالی کے دروازے کو چھو پائی..... ''میں نے آپ کی قرأت سُنی ہے قاری جی! اس گلی کا تیسرا مکان، جہاں آپ ماسٹر نذیر کے بچوں کو پڑھانے آتے ہیں، وہ بھی ہمارا ہی ہے، وہیں آتے جاتے آپ کی قرأت کانوں میں پڑی اور آپ کو سچ بتاؤں اسی قرأت سے میرے دل میں قرآن کا شوق پیدا ہوا، ورنہ میں کیا؟'' اور یہ شوق کیا۔ قرآن کا شوق..... قاری کھڑا کھڑا مٹی ہونے لگا، میری آواز سے؟ یہ انکشاف بھی کچھ کم حیران کن نہ تھا، جی ہاں! آپ کی آواز سے..... دروازے کے پیچھے سرسراہٹ ہوئی اور گلابی ڈوپٹے کے رنگ دور تک پھیلنے لگے، قاری نے گھبرا کر نگاہ اور نیچے کر لی، آپ کو معلوم ہے قاری جی! آپ کی قرأت میں تو کافر کو مسلمان کرنے کی طاقت موجود ہے۔ میں بیچاری لاکھ دین سے دور سہی، مگر ہوں تو پھر بھی مسلمان ہی! اس کے سامنے بھلا کیسے ٹھہر سکتی تھی میں؟ کئی دنوں سے آپ کی راہ دیکھ رہی تھی، آپ شاید دیر بعد آئے ہیں، اس طرف.....؟''..... ''جی ہاں! میں اپنی اماں سے ملنے چلا گیا تھا۔''..... اماں سے؟ کہاں رہتی ہیں وہ؟..... ''وہ سرگودھے کے ایک پنڈ میں رہتی ہیں!.....'' اچھا، اچھا، تو پھر کب آئیں گے ہمارے گھر؟'' کل بعد از دوپہر.....'' قاری نے کھڑے کھڑے فیصلہ کر لیا، یہ اور بات فوراً ہی پچھتانا بھی شروع کر دیا۔ اسی لیے کندھے پر رکھے چارخانے کے رومال سے پانی کی طرح بہتا پسینہ پونچھتا واپس ہوا تو اس کا ذہن عجیب اُلجھن کا شکار تھا۔ چاہتا تھا واپس جا کر انکار کر دے اس غرض سے ایک دفعہ مڑ کر دیکھا بھی۔ مگر جالی کا سبز دروازہ بند تھا اور سامنے لگے 60 واٹ کے بلب پر پتنگوں کے ڈھیر جمع تھے۔

''آپ کا نام کیا ہے بی بی!''.....''رخسانہ.....رخسانہ تنویر''.....''اچھا.....بی بی، میں آپ کو پردے کے پیچھے بیٹھ کر پڑھایا کروں گا!''.....''جی بہت اچھا''.....! رخسانہ تنویر نے اگلے ہی دن بیٹھک میں جالی کا پردہ لگوا لیا، اب بیٹھک کے اندر قاری صاحب، اور دوسری جانب جہاں باورچی خانہ تھا، رخسانہ تنویر ہوتی۔ گود میں تاج کمپنی کا موٹی پرنٹنگ کا قرآن جو چائنا پتی کے زعفرانی رنگ کے خوبصورت جزدان میں لپٹا ہوا تھا۔ قاری فیض نے اپنی بے پناہ قرأت سے ابتدا کی۔ جس کا گداز، رگوں میں روشنی لیے اترتا تھا، اور دلوں کو اپنی جانب مقناطیسی کشش سے کھینچتا تھا۔ الحمدللہ رب العلمین کی آواز رخسانہ تنویر تک پہنچی، تو اس کا دل اُچھل کر حلق میں آ گیا، اور سارا وقت قرآن گود میں بچھائے وہ چھم چھم آنسو گراتی رہی، رک رک، حرف اٹھاتی رہی! شوق کا یہ حال قاری کے جانے کے بعد بھی، قرآن کھولے گھنٹوں بیٹھی رہتی، اور زیریں، زبریں، مدیں، پیشیں سمجھتی رہتی، حرف جوڑتی رہتی، سیاہ پرنٹنگ پر ہاتھ پھیرتی رہتی اور آنکھوں کو لگاتی رہتی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے دنوں میں پہلا پارہ ختم کر لیا۔ چھوٹی دعائیں، متفرق سورتیں اور یٰسین شریف کے اسباق بھی جاری تھے۔

رخسانہ تنویر، اچھی شاگرد ثابت ہو رہی تھی، قاری اب اس جانب سے مطمئن دکھائی دیتا تھا، ہفتے کے وہ تین دن جو بھگوان پورے کی پتلی گلی کے وسیع و عریض مکان میں، رخسانہ تنویر کو پڑھاتے ہوئے گزرتے، ان کی اب قاری کو کچھ اُلجھن نہ رہی تھی!

ماسی گُلاں کا اصرار تھا، قاری کو اب شادی کر لینا چاہیے۔ سنولی، شگری کے بھی کم عمری میں نکاح ہو گئے اور وہ رخصت ہو کر پھپھی اور چاچے کے گھر چلی گئیں، میں اکیلی رہ گئی ہوں ''فیض! اب مجھے نوں کی ضرورت ہے.....''نہیں اماں میں ابھی شادی نہیں کر سکتا، سکول کی نوکری بھی نئی ہے اور میں نے ایم۔اے اسلامیات کا امتحان بھی دینا ہے۔ جب تک یہ امتحان پاس نہیں ہو گا، میرا گریڈ نہیں بڑھے گا''.....''تمہاری پڑھائیاں تو چلتی رہیں گی، مگر میرا کیا بنے گا، اس چار دیواری میں اب مجھ سے اکیلے نہیں رہا جاتا''.....اماں خدا کا خوف کرو، تم تو اپنوں میں رہتی ہو، اکیلا تو میں ہوں، اس دور دور تک پھیلے ہوئے اجنبی شہر میں، تمہیں معلوم ہے اماں! کئی دفعہ سائیکل چلاتے ہوئے مجھے لگتا ہے جیسے میری زندگی، انہی سڑکوں پر پوری ہو جائے گی، اور جب کبھی میں مڑ کر پیچھے دیکھوں گا تو، کالی شاہ دیوار ہو گی، جس پر لکھا ہو گا ''یہاں سے گلی بند ہے''.....''ایسی باتیں نہ کیا کر فیض! مجھے تمہاری ان باتوں کی سمجھ نہیں آتی، میں تو بس سیدھی سی گل جانتی ہوں، نکے بھرا کو تم نے لہور کے ہوسٹل میں ڈالا ہوا ہے، مجھے یہاں الگ سے خرچہ دیتے ہو، اور اپنے اوپر بھی کچھ نہ کچھ تو خرچ کرتے ہی ہو گے، آخر شہر داری ہے۔ جہاں سوائے ہوا کے سب کچھ مُل کا ہے۔ تو اچھا نہیں، میں تمہاری شادی کر دوں اور ہم لہور میں ہی اکٹھے رہنے لگیں۔ اس طرح دوری بھی نہیں رہے گی، اور خرچہ بھی بچے گا''.....تمہاری بات ہے تو ٹھیک، مگر امّاں' مجھے ابھی تھوڑا وقت چاہیے''.....''کتنا وقت؟'' سال دو سال۔ نہ نہ، بچڑا، تمہارا چاچا اتنی دیر انتظار نہیں کر سکتا، وہ کہتا ہے پھاپی کی عمر گزری جا رہی ہے، میں بھائی نورے کو زبان دے کر مجبور ہو چکی ہوں، مجھے اور نہ آزماؤ!''

''قاری جی! آج آپ کا دھیان کدھر ہے؟'' رخسانہ تنویر کی آواز، قاری کو گاؤں اور اس کے مسائل سے واپس کھینچ لائی۔ اس لق و دق شہر میں جہاں اس کا جی بھی نہیں لگتا تھا مگر رہنا بھی ضروری تھا۔ ''کیوں بی بی کیا ہوا؟''.....''میں سورۂ رحمٰن

پڑھے جارہی ہوں، اور آپ نے مجھے درمیان میں ٹوکا بھی نہیں، حالانکہ اندازے سے مجھے معلوم ہورہا تھا، میں نے کئی جگہ غلطی کی ہے۔'' .....''غفلت کی معافی چاہتا ہوں بی بی، میں دراصل کہیں دور پہنچا ہوا تھا۔'' .....''پردے سے بھی دور قاری جی؟'' ..... ''جی.....میں سمجھا نہیں؟'' .....''جب آپ سمجھنا ہی نہیں چاہتے تو کیسے سمجھ آئے! جالی کے پردے کے پیچھے کی دنیا میں آج عجب ہلچل مچی ہوئی تھی، قاری نے گھبرا کر دیکھا، جالی کے ننھے سوراخوں کے اس طرف سبز رنگ کی قیامتیں اُٹھ رہی تھیں جیسے سمندر سے جوار بھاٹا، قاری نے جلدی سے نگاہ سمیٹ لی اور کان پر ہاتھ رکھ کر، سینے کی تہہ سے، سوز میں ڈوبی آواز نکالی ''یاایھا المزمل، قم اللیل الاقلیلا! اور سبز رنگ کی قیامتوں کو قرار آنے لگا، سمندر کی متلاطم لہریں سکون پکڑنے لگیں، رخسانہ تنویر نے سر جھکا لیا، آنکھیں بند کر لیں، اور قرآنِ پاک کو سینے سے چمٹا لیا۔ اسکا رواں رواں جیسے حاضری میں آ گیا تھا۔ آنچل ماتھے سے نیچے سرک رہا تھا، آنکھیں بند تھیں اور وہ ہچکیوں سے بے آواز رو رہی تھی، روتے چلی جارہی تھی!

جس روز اذانِ مغرب کے بعد رخسانہ تنویر نے دعائے ختم القرآن پڑھی، اسی روز صبح دس بجے قاری نے مدینہ کالونی میں دو مرلے کا وہ مکان خرید لیا جس کے لیے وہ ایک عرصے سے دوڑ دھوپ کر رہا تھا۔ سکول سے قرضہ، کمیٹیاں اور مختلف بچتیں ملا کر وہ اس قابل ہوا تھا کہ اس اجنبی شہر میں ایک ٹھکانہ بنا سکے، جس کی سڑکوں پر سائیکل چلاتے چلاتے، اس کا تاریخ جغرافیہ گڈمڈ ہونے لگا تھا اور وجود میں اک ایسی تھکن ٹھہرتی جارہی تھی، جس کا اثر دماغ تک پہنچنے لگا تھا۔

''اللھم انس وحشتی فی قبری اللھم ارحمنی بالقرآن العظیم واجعلہ لی اماما ونورا وھدی ورحمتہ''۔ دعا کے بعد قاری منہ پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔ ''مبارک ہو بی بی۔'' .....''یہ مبارک تو آپ کو ہے قاری صاحب! جس لگن سے آپ نے مجھے قرآن پڑھایا ہے، میری جگہ پتھر بھی ہوتا تو پڑھ لیتا، میں تو پھر انسان ہوں۔'' .....''بی بی! آپ کو ایک بات بتاؤں، استاد ہمیشہ اچھے شاگرد کی تلاش میں ہوتا ہے، یہ استاد کی خوش قسمتی ہوتی ہے کہ اسے ایسا شاگرد مل جائے.....جو خود کسی اچھے استاد کی تلاش میں ہو!'' .....''تو گویا آپ کو بھی میری تلاش تھی؟'' رخسانہ تنویر کی آواز میں شوخی کی کھنک تھی، جو جالی کے پردے سے چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔'' جیسے آپ کو میری تھی اسی طرح۔'' گھر خریدنے کی خوشی میں قاری کا موڈ بھی اچھا تھا۔ خلافِ معمول ہنس کر بولا ''مگر میری تلاش تو بہت پرانی ہے قاری جی!'' .....''کیا مطلب؟'' قاری چونکا۔ ''چھوڑیں کیا کریں گے پوچھ کر، یہ بتائیں اب آپ کی خدمت میں کیا پیش کروں؟ آپ نے میرے سینے میں قرآن کا نور اُتارا ہے۔ یہ ایسا تحفہ ہے جو ہمیشہ میری روح کو سرشار رکھے گا۔ میں اس احسان کا بدلہ تو کبھی نہیں اُتار سکتی، بس یہ حقیر سا نذرانہ ہے!'' جالی کا پردہ درمیان سے ذرا سا کھسکا اور مہندی لگے سنہری ہاتھ نے، سرخ رنگ کی ویلوٹ کی ایک تھیلی قاری کی طرف بڑھائی، ''انکار نہ کیجئے گا قاری جی! ورنہ میرا دل ٹوٹ جائے گا!'' .....کیا ہے یہ؟ ''قاری نے جھجکتے ہوئے نگاہ اٹھائی، ''کھول کر دیکھ لیجیے۔'' تھیلی پکڑتے ہوئے قاری کی نگاہ ڈول گئی، مہندی لگا سنہرا ہاتھ، نگاہوں کی بندش توڑتا، بصارتوں سے کھیلتا دل کے کسی دور دراز علاقے کو نکل گیا۔ سخت سراسیمگی کے عالم میں، قاری نے تھیلی کی ریشمی

ڈوری کھولی، تھیلی قیمتی زیورات سے منہ تک بھری ہوئی تھی جو 60 واٹ کے بلب کی پیلی روشنی میں بھی ایسے چمک رہے تھے کہ ان پر نگاہ نہ ٹھہرتی تھی۔ تھیلی میں جھانکتے ہی قاری نے گھبرا کر نگاہ ہٹالی اور بے اختیاری میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں یہ سب نہیں لے سکتا۔'' اضطراری حالت میں اس نے جالی کا پردہ تھاما، دوسری جانب سے جیسے پردہ کھلنے کا منتظر ہی تھا، تھیلی ہاتھ میں لیے، اب قاری پھٹی پھٹی نگاہوں سے، وہ منظر دیکھ رہا تھا جس میں رخسانہ تنویر سب سے زیادہ نمایاں تھی، پیلے کپڑوں میں سرتاپا ملفوف، صرف چہرہ کھلا تھا۔ سر جھکائے، اس کے سامنے ایسے کھڑی تھی جیسے پرانے مندروں سے نکلی ہوئی حیران جوگن! اس کا سنہری چہرہ اداسی سے چور چور تھا، اور آنکھیں جیسے لمبی بے خوابی کی تھکن سے اٹھنے کے قابل بھی نہ رہی تھیں۔ ''بی بی! میں یہ نہیں لے سکتا'' کہتے ہوئے قاری نے کانپتے ہاتھوں سے تھیلی اس کی طرف بڑھائی۔ ''کیوں قاری جی؟'' جوگن کے ہونٹ پھڑ پھڑائے، ایسے جیسے رنگین تتلیوں کے پر آپس میں ٹکرائے ہوں، قاری کوشش کے باوجود، رنگ نہ گن سکا، زندگی میں پہلی دفعہ نگاہیں نہ سمیٹ سکا، ہونقوں کی طرح آنکھیں پٹ پٹاتا، اسے دیکھے چلا گیا۔ ''فِیھِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ''۔ ہوں گی ان نعمتوں کے درمیان شرمیلی نگاہ والیاں، کہ نہ چھوا ہو گا، انہیں کسی انسان نے ان سے پہلے اور نہ کسی جن نے، سو اپنے رب کے کن کن انعامات کو جھٹلاؤ گے۔'' سارا منظر جیسے سورۂ رحمٰن کی تلاوت کرنے لگا۔ ''کیوں قاری جی'' دوبارہ آواز آئی! تتلیاں اپنے ہی رنگوں کی بارش میں جیسے نہانے لگیں۔ ''کیونکہ میں آپ سے ماہانہ طے شدہ ہدیہ وصول کرتا رہا ہوں بی بی!'' قاری کے ہونٹ بمشکل ہلے۔ ''ہدیہ، وہ چند روپلی، آپ کی مطمئن طبیعت کیلئے تو شاید تسکین کا باعث ہوں مگر میرے لئے نہیں۔ آپ کو معلوم نہیں کتنی بڑی نیکی کی ہے آپ نے میرے ساتھ اگر آپ جانتے تو کبھی انکار نہ کرتے۔'' ...... ''میں نے اپنا فرض ادا کیا ہے بی بی ......!'' ''اور میں نے اپنا تو پھر آپ انکار کیوں کر رہے ہیں؟'' بوجھل آنکھیں پہلی دفعہ اُٹھیں اور قاری کے مہربان چہرے پر ٹک گئیں۔ ''کیا آپ کو معلوم ہے، میں کون ہوں؟'' ...... ''آپ رخسانہ تنویر زوجہ تنویر احمد ٹھیکیدار۔'' قاری ہکلاتے ہوئے بولا۔ ''اونہہ پچھلے آٹھ ماہ میں آپ نے کبھی تنویر احمد ٹھیکیدار کو یہاں دیکھا ہے؟'' ...... ''میرا خیال ہے...... نہیں۔ اونچے لمبے، ذہین آنکھوں والے قاری نے ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ ہیں تو آپ زوجہ...... تنویر احمد...... ٹھیکے......!'' ...... ''فرق پڑتا ہے، بہت پڑتا ہے قاری جی!'' بات کاٹتے ہوئے وہ بولی، ''ٹھیکے دار تنویر احمد کے پردے میں اس مکان میں صرف یہ اکیلی عورت رہتی ہے، مگر آپ نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔'' ناک کی سیدھ میں چلنے والا قاری یہ سن کر قدرے پریشان ہوا۔ ''بی بی! میں اپنے کام سے کام رکھتا ہوں، ایسی باتوں پر غور کرنے کی مجھے فرصت نہیں۔'' سچ کہتے ہیں آپ! مگر میرے پاس تو قاری صاحب، فرصت ہی فرصت ہے، اسی لیے آپ کی راہ دیکھتی ہوں، آپ کی قرأت کیلئے دل تڑپتا رہتا ہے۔ قرآن کھولے گھنٹوں بیٹھی رہتی ہوں۔ میرے ساتھ تو آپ کی قرأت نے عجب کیا۔ کام، کاروبار، گھر، محلّہ، سب کچھ چھڑوا دیا۔ زربانو کو رخسانہ تنویر بنادیا، وہ تنویر احمد جس کا وجود میں نے اور اس گھر نے کبھی نہیں دیکھا۔'' ...... ''کیا کہہ رہی ہیں آپ...... بی بی؟'' قاری انکشافات کی اس بوچھاڑ کے سامنے کچی مٹی کے تھوبے کی طرح رکھا دھیرے دھیرے گھل

رہا تھا۔''زربانو، نہیں رخسانہ تنویر کی آنکھوں سے بے رنگ پانی نکل نکل کر، اس کے شیشے کی صراحی جیسی، ٹرانسپیرنٹ گردن کو بھگوئے چلا جارہا تھا۔ چمکیلی صراحی جیسے کچے پسینے کی زد پہ تھی۔'' قاری جی! میں یہ تو جانتی تھی، زربانو رخسانہ تنویر کا روپ نہ دھارتی تو آپ اسے کبھی نہ پڑھاتے مگر میں یہ نہیں جانتی تھی رخسانہ تنویر زربانو کے ساتھ یہ سلوک کرے گی۔ خود تو ڈیوڑھا ڈوپٹہ اوڑھ کر قرآن کے سامنے دوزانو بیٹھ گئی اور زربانو کے سارے ہتھیار کند کر دیئے۔ اس کی وہ ادائیں جنہیں بیچ کر وہ شہر کی قیمتی اور مہنگی عورتوں میں شمار ہوتی تھی، انہیں خود سے بھی شرمندہ کر دیا۔ زربانو کے ایسے کس بل نکالے کہ پسپائی کی حالت میں وہ بھاں بھاں کرتی، کوٹھے کی دیوار سے لگ گئی اور یہ بھول ہی گئی کہ کبھی وہ اس شہر کی ادائیں بیچنے والی عورتوں میں منفرد اور انوکھی تھی۔ یہ سب کیوں اور کیسے ہوا، کیا یہ بھی نہ پوچھیں گے؟'' قاری، جھپ جھپ آنکھیں جھپکتا، مٹی کا بُت، نہ ہلنے کے قابل نہ بولنے کے۔ جوگن کے جلوے سے زیادہ اسکی بپتا نے اسے گنگ کر دیا تھا، ریڑھ کی ہڈی سے اُٹھنے والی سنسنی اب پورے وجود میں جھکڑ جھولے کی طرح گھل کر، اسے خشک پتہ بنانے پر تلی ہوئی تھی، جوگن اس کے سامنے جگ سا پزل کی طرح کھڑی تھی اور وہ بوجھنے پر آمادہ دکھائی نہ دیتا تھا۔''بی بی..... میں جاؤں؟'' قاری کے گلے سے کراہ جیسی آواز بمشکل نکلی، اور اس نے اندھوں کی طرح، اندازے سے قدم آگے بڑھائے.....''مگر آپ کیسے جاسکتے ہیں قاری جی؟'' وہ رخسانہ تنویر تھی یا زربانو، جو بھی تھی، اس کی حیرت بجا تھی۔ ''بی بی! مجھے جانا ہے، میں یہاں مزید نہیں رک سکتا''، قاری کی وحشت انتہا پر تھی۔''اگر میں روک لوں تو؟'' آواز میں آرزو کی شدت اس درجہ تھی، کہ قاری کو لگا اگر ایک پل بھی اور ٹھہرا تو پگھل کر ٹھوس سے مائع ہو جائے گا۔ زیورات کی تھیلی اس کے سامنے پھینک کر وہ دیوانوں کی طرح باہر بھاگا، جوگن کا پیلے ڈوپٹے میں لپٹا، نرم بھیگا ہوا چہرہ، شدید آندھیوں کی زد میں آ گیا،''قاری جی! آپ مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتے''، وہ چلائی۔ مگر ہانپتا کانپتا قاری جالی کا دروازہ الانگتا، چوکھٹ پھلانگتا، سائیکل گھسیٹتا، بھگوان پورے کی پتلی گلی سے ایسے نکلا جیسے تیر کمان سے نکلتا ہو!

''اس کے بعد کیا ہوا فیض؟'' میں نے بے صبری سے پوچھا۔''اس کے بعد کیا ہونا تھا باجی! میں نے اس علاقے میں جانا ہی چھوڑ دیا۔ مدینہ ٹاؤن میں ٹھکانہ کرلیا، اماں اور پھاپی نے گھر سنبھال لیا، جہاں آپ بھیجتی رہیں، وہاں میں بچوں کے درس قرآن کیلئے جاتا رہا، سائیکل کی گدی پر زندگی بسر کی۔ جو ہوا اس کے بعد، وہ آپ کے سامنے ہی تو ہے۔''.....''ہاں.....ٹھیک کہتے ہو، چاچے نورے کے گھر سے خصوصی تعلقات کی وجہ سے، اس کے سفر کی لحہ لحہ کہانی میرے سامنے تھی۔ مگر یہ رخسانہ تنویر.....؟ ایسا چھپا ہوا گوشہ تھی جسے فیض نے انکشاف کے کسی عجیب ترین لمحے میں، مجھ پر آشکار کیا تھا۔ اکثر جب وہ بہت تھک جاتا تو فون کر کے مجھ سے وقت مانگتا اور میرے پاس آ کر بیٹھ جاتا۔ مسلسل جدوجہد، دشواریوں اور کڑی محنت کی اس کہانی میں کئی مقام ایسے آئے کہ وہ آنکھیں نیچی کیے بے تکان بولتا چلا جاتا، اور میں ہنستی رہتی۔ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے بعد اُٹھنے لگتا تو میں اس سے سورۂ رحمٰن کی قرأت کی فرمائش کر دیتی، وہ کان پر ہاتھ رکھ کر''الرحمٰن علّم القراٰن'' سے ابتدا کرتا تو''فبایّی الاء ربکما تکذبٰن'' تک، اردگرد کا سارا

ماحول قرأت کی پھوار سے بھیگتا چلا جاتا۔

باپ کے یتیموں کو پالنے اور انہیں زندگی کی دوڑ میں شامل کرنے کے قابل بنانے پر، عمر کا بڑا حصہ لگا دینے کے بعد، اپنے چھ عدد یتیم خدا کے آسرے پر چھوڑ کر اچانک ملکِ عدم روانہ ہونے والے قاری فیض سے، ابھی چند روز پہلے ہی تو میں نے پوچھا تھا۔ فیض! کبھی رخسانہ تنویر کی یاد آئی؟''..... ''باجی آپ کہانیاں لکھتی ہیں نہ، اسی لیے پوچھ رہی ہیں۔'' وہ ہنس پڑا..... ''بات دراصل یہ ہے باجی۔ وہ اک شہزادی تھی، سچ مچ کی شہزادی اور میں شوہدا، گلیوں کا روڑا کوڑا، بے اوقاتا، پردیسی! خدا جانے کس موج میں تھی وہ۔''..... ''وہ موج میں نہیں تھی فیض۔ اس کا شوق، وارفتگی اور ذات کے اندر اتنی بڑی تبدیلی، وقتی موج یا کسی بھولے بھٹکے خیال کی لہر سے ممکن نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اس کے لیے پیچھے طاقت ور فورس چاہیے۔ اتنی طاقت ور کہ سیپی سے موتی کو اچھال کر ساحل پر ڈال دے، وہ کسی وقتی اثر میں نہ تھی۔ سچ مچ کی تبدیلی کی زد میں تھی۔ اسی لیے.....؟'' اچھا.....؟ ہنستے مسکراتے فیض کا چہرہ یکدم حیرت، افسوس اور پچھتاوے سے بھر گیا۔ ''مگر میں نے تو سمجھا تھا، تم غلط سمجھے تھے۔ کیا کہہ رہی ہیں باجی، فیض کے چہرے پر دھول اُڑنے لگی۔ اس کا سر جھک گیا، ٹھوڈی سینے سے جا لگی۔ آنکھوں سے پانی کے چند قطرے نکلے اور پھسلتے ہوئے اس کی سفید داڑھی کے بالوں میں اٹک گئے، سچّے موتیوں کی مانند!

اس رات گھر کی مختصر چھت پر، بے قراری سے ٹہلتے ہوئے اس نے محسوس کیا، تھکان اس کی ہڈیوں کو کاٹتی، نسوں میں گھستی چلی جا رہی ہے، خون میں پھیلتی چلی جا رہی ہے۔ لمبا سفر، کڑی دھوپ اور سائیکل کا پہیہ، کیا یہی تھی زندگی؟ اس نے آس پاس نظر دوڑائی، یہاں سے شہر کو دیکھو! شور، دھوئیں اور ہنگاموں سے بھرا، شہر لاہور اس کے سامنے تھا، اپنے برجوں، میناروں، مسجدوں، منبروں، نئے پرانے محلوں، گلیوں اور نت نئے مسائل کے ساتھ..... لاہور جس سے اُکتا کر بھی، اسے چھوڑنا ممکن نہیں ہوتا، کتنی عجیب بات! اور اس سے زیادہ عجیب بات یہ کہ..... یہاں رخسانہ تنویر رہتی ہے، ایک وسیع و عریض مکان میں تنہا، قرآن کو سینے سے چمٹائے، اس میں کبھی موتیا کبھی چنبیلی کے پھول رکھتی، اس کے جزدان بدلتی اور اس کے حرف، قرأت کے انداز میں اٹھاتی۔ اس عجیب شہر میں اک عجیب عورت رہتی ہے، جس کی یاد دل کے کسی چھپے ہوئے حصے سے باہر نکل کر، اب پوری شدت سے اس پر وارد ہو رہی ہے۔ اسی لیے بائیں پہلو سے درد اُٹھ اُٹھ کر، اسے بتا رہا ہے کہ وہ بھلائے جانے والے لوگوں میں سے نہ تھی۔ ہرگز نہ تھی، سینے کو بائیں ہاتھ سے دباتے ہوئے قاری سائیکل کے پیڈل تیزی سے گھماتا، بھگوان پورے کی پتلی گلی میں داخل ہوتا ہے۔ سفر میں واقعی اگر کوئی پڑاؤ ہے، تو صرف یہی۔ کسی نے ابھی ابھی اس کے کان میں سرگوشی کی ہے۔ وہ دیکھتا ہے، جالی کا سبز دروازہ کھلا ہے اور اس کے پیچھے گلابی رنگ کی بارشیں مسلسل برس رہی ہیں، اک مہندی رنگا سنہرا ہاتھ اسے رکنے کا اشارہ کر رہا ہے۔ قاری جی! جالی کے دروازے کے پیچھے سے آواز اُبھرتی ہے اور سائیکل کا کبھی نہ رُکنے والا پہیہ تھم جاتا ہے، ہمیشہ کیلئے، اور.....!

◆◆◆

لال قلعہ

سرور سکھیرا

لندن آنے کے بعد اب انگریز لڑکیاں میرے لئے چیلنج نہ تھیں۔ کس بھی لڑکی کی حیثیت میرے نزدیک پاکستان میں ہمارے گھر کے سامنے والی بیری کی سی تھی جس پر میں اتنے اعتماد اور پھرتی سے چڑھتا تھا کہ اگر کوئی آنکھیں بھی باندھ دیتا تو بھی میں کہیں نہ تھڑکتا۔ یہی بیری شروع شروع میں مجھے کوہ ہمالیہ جتنی اونچی نظر آیا کرتی تھی اور میں اس پر پکے پکے سرخ بیر بڑی حسرت بھری نگاہ سے دیکھا کرتا اور سوچتا کہ وہ لوگ جوان بیریوں پر چڑھ سکتے ہیں بڑے کمال کے ہوں گے۔ وقت وقت کی بات ہے، ایک دن وہ بھی آ گیا جب بیری مجھے اپنے گھٹنے برابر لگنے لگی۔

صبح بھی میں ''ڈیٹ پر بیٹرسی'' پارک گیا تھا۔ وہاں جھولوں میں جھولے۔ جب جھولا بلندی سے نیچے کو آتا تھا تو دم سا نکل جاتا تھا۔ اتنے اونچے بجلی کے جھولے پر یوں تیزی سے جھولنا کوئی آسان بات نہ تھی، اور خاص طور پر لڑکیاں تو بری طرح خوفزدہ ہو جاتی تھیں۔ مجھے یہ جھولے اس لیے پسند تھے کہ جب وہ گھبراہٹ میں ہوتی تھیں تو میں بلاخوف، بڑے اطمینان کے ساتھ بیٹھا ہوتا تھا اور مجھے یوں پرسکون بیٹھا دیکھ کر وہ خوفزدہ لڑکیاں مجھ پر چپک جاتی تھیں۔

لڑکیوں کو اپنے قریب لانے کا یہ گر میں اکثر بار آزما چکا تھا۔ اور پھر ہاتھ کی لکیریں دیکھنے والا بہانہ اب اس قدر عام ہو چکا تھا کہ ہم ایشیائی لوگوں کے علاوہ یہاں کے لڑکوں نے بھی کام میں لانا شروع کر دیا تھا۔ آج میں بڑی شاندار لڑکی کے ساتھ جھولا جھول چکا تھا اور شام کو پھر میری ایک اور کے ساتھ ڈیٹ تھی۔ اس نے چیئرنگ کراس سٹیشن کے باہر سٹرینڈ میں میرا انتظار کرنا تھا۔ وہ میرا انتظار کر رہی تھی، بڑی بن ٹھن کے آئی ہوئی تھی۔ باریک سا سکارف بالوں میں بندھا ہوا تھا، سویڈ کا بیژ رنگ کا کوٹ پہنے تھی، گلوز، بیگ اور جوتے میچنگ تھے۔ وہ بے تاب اور کچھ کچھ نروس بھی لگ رہی تھی۔ بار بار ہونٹوں کو ملا ملا کر کھولتی تھی جیسے لپ سٹک برابر کر رہی ہو۔ وہ آہستہ آہستہ ٹہل بھی رہی تھی جس سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ واقعی شدت سے میری منتظر ہے۔ یہ میری فتح کی نشانیاں تھیں لیکن میں آج دوپہر اپنی بھوک مٹا چکا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ اسے اسی حالت میں چھوڑ دینا چاہیے، یوں جیسے کھانے کی بھری میز سے کوئی اٹھ جائے۔

میں چیئرنگ کراس ٹیوب سٹیشن پر انڈر گراؤنڈ ٹرین پکڑنے چلا آیا۔ ڈسٹرکٹ لائن کی ارلز کورٹ آنے والی ٹرین میں سوار ہوا تو اچانک مجھے اپنے ساتھ ایک سانولی سی، تیکھے تیکھے نقوش والی، بیس اکیس سال کی لڑکی ساڑھی پہنے بیٹھی نظر آئی۔ وہ مجھے یوں لگی جیسے بہت سارے ابلے چاول کھانے کے بعد پلاؤ دکھائی دیتا ہے۔ اس میں سے ایک بڑی قدرتی اور بھینی بھینی سی غیر روائیتی قسم کی خوشبو آ رہی تھی جس سے میں نے محسوس کیا کہ اس نے میک اپ نہیں کیا ہوا۔ لڑکی مجھے پسند تھی اور میں مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا، کیا پتہ اگلے ہی سٹیشن پر اتر جائے۔ میں نے بڑی مہارت کے ساتھ فقرہ پھینکا۔ ''شکیلہ کیا حال ہیں تمھارے؟ کہاں ہوتی ہو؟ کب آئی؟ تم دس سالوں میں بہت بدل گئی ہو یار۔''

اس نے اپنی جھیل ایسی آنکھیں میری طرف پھیریں۔ وہ مجھے بالکل ایسے لگی جیسے کوئی ہرنی جنگل میں گھاس چر رہی ہو اور اچانک کھٹاک کی آواز پر چونک اٹھے۔ وہ حیران نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے فوراً معذرتوں والا جال تیار کرنا شروع کر دیا، لیکن میرے جال پھینکنے سے پہلے ہی وہ یکا یک مسکرا اٹھی۔ اتنی شدید مسکراہٹ میں نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ ''نہیں، میرا نام تو پورنیما ہے۔'' وہ کافی بدھو تھی جبھی تو کھٹاک سے نام بتا دیا۔ نہ غصے ہوئی، نہ منہ پھیرا، نہ چپ کا تالا لگایا۔ پورنیما ہندو نام ہے، یہ یقیناً ہندوستان سے آئی ہوگی۔ میں جان گیا اور فوراً میرے اندر بگل بجنے لگے۔ آج تک سب جنگی مشقیں تھیں، اعلان جنگ تو آج ہوا تھا۔ ہندو قوم بڑی عیار ہے اور اس کے بھولپن کے کیموفلاج سے مجھے دھوکا نہیں کھا جانا چاہیے۔ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ سٹریٹجی بنائی۔ ''اچھا اچھا یونیورسٹی کالج والی پورنیما!''

''لیکن آپ کو یہ کیسے پتہ چلا کہ میں وہاں پڑھتی ہوں؟'' وہ حیران ہوئی۔ میں نے اس کی بات پر کہانی گھڑنی شروع کر دی، حالانکہ بات صرف اتنی تھی کہ اس کی گود میں جو نوٹ بک پڑی تھی اس پر 'یونیورسٹی کالج لندن' چھپا ہوا تھا۔ وہ ٹیک لگا کر آرام سے بیٹھ گئی جس سے صاف ظاہر تھا کہ اس نے میری کہانی پر یقین کر لیا ہے۔ ارلز کورٹ کا سٹیشن آیا اور میں بیٹھا رہا کیونکہ مسلسل کامیابیاں ہو رہی تھیں اور فوج آگے بڑھ رہی تھی، ایسے میں کون جنگ بندی کرتا ہے۔ رچمنڈ پر وہ اتری اور شین روڈ کی طرف چلدی۔ میں بھی ساتھ ہولیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اسے لندن آئے ہوئے صرف ایک ماہ ہوا تھا۔ اس کا باپ بمبئی یونیورسٹی میں فلسفہ کا پروفیسر تھا اور یہاں وہ اپنے باپ کے ایک دوست کے ہاں رہتی تھی۔ جو ہندوستان چھوڑ کر یہاں آ بسا تھا۔ اس پروفیسر کی دو لڑکیاں تھیں اور اس طرح اس کا دل بھی لگا رہتا تھا۔ زمین مجھے بڑی زرخیز لگی۔ تین جوان لڑکیا اور وہ بھی ہندو، میرا دل آنے والے وقت کا سوچ کر دھڑکنے لگا۔ وہ چلتے چلتے اچانک کھڑی ہوگئی اور پوچھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اپنے ایک دوست کو ملنے جا رہا ہوں جو اتفاق سے اسی طرف رہتا ہے۔ اس جواب سے اس کی تسلی ہوگئی۔ ہم پھر پہلو بہ پہلو چلنے لگے۔ اس کے پوچھنے پر میں نے بتایا کہ میں 'ایل ایس ای' میں پڑھتا ہوں اور فیروز پور (ہندوستان) سے ہوں۔ کہنے لگی کہ وہ بھی فیروز پور میں رہ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ اس کے باپ کی اتنی جگہ تبدیلیاں ہو چکی تھیں کہ اب اسے پتہ ہی نہیں چلتا تھا کہ وہ کہاں کی

رہنے والی ہے۔ میں نے کہا کہ اپنا شہر وہی ہوتا ہے، جس سے انس ہو

''اُنس تو مجھے لاہور سے ہے اگرچہ میں اس وقت چھوٹی سی تھی جب پارٹیشن ہوئی۔ لیکن میرے ماتا پتا جس انداز سے اس شہر کی باتیں کرتے ہیں، مجھے وہ شہر بہت اچھا لگتا ہے، اور لاہور کا نام جب میں پڑھتی یا سنتی ہوں تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے کوئی میرے اپنوں کی بات کر رہا ہو، بالکل ایسے ہی جیسے میری مرحومہ نانی اماں کی باتیں کی جاتی ہیں۔'' میں نے لائن کلیئر پائی تو فوراً بول اٹھا ''میں بھی لاہوری ہوں، اور فیروز پور میں تو صرف پیدا ہوا تھا، رہتا میں لاہور میں ہوں۔'' وہ جیسے خوشی سے اچھل پڑی۔

میں نے دشمن کو یوں دوبارہ بچھڑتا دیکھ کر فوراً بھرپور حملہ کیا اور کل دوبارہ ملنے کا وقت مانگا۔ وہ اس شرط پر مان گئی کہ میں اسے لاہور کی باتیں سناؤں گا۔ بعد میں اس نے مجھے بتایا کہ اگلے روز اس کے ہاں دعوت ہونے والی تھی جہاں تین ہندو لڑکے بلائے گئے تھے۔ دراصل وہ لوگ اپنی بیٹیوں کے لئے مناسب ہندو لڑکوں کے رشتے ڈھونڈنے کے لئے بڑے فکرمند رہتے تھے اور اکثر قانون، انجینئرنگ اور ڈاکٹری پڑھنے والے ہندو طلباء کو اپنے ہاں مدعو کرتے رہتے تھے کہ کہیں ان کی لڑکیاں غیر قوم کے لڑکوں کے ساتھ اپنے آپ منسلک نہ کر بیٹھیں۔ انہوں نے ازارہِ ہمدردی اب دو، دو کی بجائے تین تین لڑکے مدعو کرنے شروع کر دیے تھے تاکہ پورنیما کا سلسلہ بھی یہیں کچھ ہو جائے۔ ان میں سے ایک لڑکا اس کے پیچھے بری طرح سے پڑا ہوا تھا لیکن وہ اسے سخت ناپسند تھا کیونکہ وہ بہت متعصّب، تنگ ذہن اور کٹر قسم کا ہندو جن سنگھی تھا۔ بڑا خودغرض تھا اور سمجھتا تھا کہ اس زمین پر صرف اسے اور اس کے ہم قوم، ہم مذہب، ہم خیال لوگوں کو ہی جینے کا حق ہے۔ ایسے درندوں سے اسے سخت نفرت تھی جو دوسروں کو صرف اسی لئے حقارت کی نظروں سے دیکھتے ہیں کہ قدرت نے انہیں مختلف نسل، قسم، رنگ، جغرافیائی خطہ، طریقہ بود و باش اور سوچ و بچار عطا کی ہے۔ پورنیما اس روز اس لیے بھی گھر میں نہیں ہونا چاہتی تھی۔

دوسرے روز ہم ملے۔ اس نے سلیکس پہنی تھی، پونی ٹیل باندھی ہوئی تھی اور بالکل سکول کی لڑکی لگ رہی تھی۔ اسے درخت اور پانی بہت اچھے لگتے تھے اور شہر کے ہنگاموں سے دور کہیں جانا چاہتی تھی۔ ہم ٹوکنہم کے قریب ٹیمز کے کنارے چلے گئے اور بنچ پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ وہاں شام کو بہت لوگ آ جاتے ہیں۔ ہمارے قریب ہی ایک انگریز بوڑھا اور بوڑھی آ کر بیٹھ گئے اور ہماری طرف دیکھ کر مسکرانے لگے۔ جواب میں ہم بھی مسکرا دیئے۔ وہ دونوں ہمارے قریب آئے اور کہنے لگے کہ ہم دونوں ہندوستانی بہت خوبصورت اور اچھے لگ رہے ہیں۔ میں ہندو سمجھا جانے پر سٹپٹا گیا اور فوراً ان کی تصحیح کرنے لگا جس پر انہوں نے کوئی خاص توجہ نہ دیتے ہوئے یہ کہہ کر بات ختم کرنا چاہی کہ آخر ہیں تو ہم دونوں ایک ہی لوگ۔ یہ جھوٹ تھا۔ مسلمان کا خمیر چاہے کسی بھی مٹی سے اٹھے وہ ہمیشہ عرب ہوتا ہے۔ ہندوؤں کا پروپیگنڈا کس قدر مئوثر تھا اور یوں یہ انگریز پاکستان کی حقیقت کو نہ ماننے کا پکا ارادہ کر چکے تھے۔ مجھے ایک محاذ پر شکست ہو چکی تھی۔ لیکن میں نے وہاں جھگڑنا مناسب نہ سمجھا کیونکہ پورنیما کو میری بحث یقیناً ناگوار گزری تھی۔ اس روز ہم نے بہت باتیں کیں، اپنی اپنی فیملی کی باتیں، دوستوں کی باتیں، شہروں کی باتیں، محلوں کی باتیں۔

میں اسے کافی اچھی طرح سمجھنے لگا تھا، وہ اندر سے بڑی کھلی ڈلہی اور صاف شفاف تھی۔ اس کے اندر کوئی بارودی سرنگیں نہیں بچھی ہوئی تھیں، وہ کسی محفوظ مورچے میں نہیں چھپی رہتی تھی۔ اس نے کوئی ہتھیار نہ پہن رکھے تھے اور بالکل نہتی سی لگتی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ مقابلہ دشمن کے فوجی جوان سے نہیں بلکہ ایک جاسوس سے ہے جو سفید کپڑوں میں ملبوس چپ چاپ اپنا کام کئے جا رہا تھا۔

شام ہونے تک میں نے دشمن کو مکمل گھیرے میں لے لیا تھا اور مجھے یقین ہو چکا تھا کہ اب درویشانہ اطوار کی اداکاری کرتی 'ماتاہری' بچ کے نہیں نکل سکے گی۔ اگلے روز ہم پھر ملے۔ آج وہ بڑے اچھے کپڑے پہن کر آئی تھی اور ہلکا ہلکا میک اپ بھی کیا ہوا تھا۔ ہم پرنس آف ویلز تھیٹر میں ''ہیلو ڈولی'' پلے دیکھنے گئے، پھر لیسٹر سکوئر میں اینگس سٹیک ہاؤس پر کھانا کھایا۔ وہ بے حد خوش لگ رہی تھی اور میں اپنی ہر چال اور ہر سکیم میں کامیاب ہو رہا تھا۔ اس کے بعد ہم کئی بار ملے اور بہت قریب آ گئے کہ ایک روز اچانک میں نے شام کے اخبار میں پڑھا ہندوستان اور پاکستان میں جنگ چھڑ گئی تھی اور ہندوستانی فوجوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا تھا۔ میں سخت غم و غصہ میں تھا، مجھے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا کروں؟ میں اسی شام اس کو ملنے کی بجائے اپنے ہائی کمیشن گیا، پاکستانی دوستوں سے باتیں کیں اور چندہ اکٹھا کرنے کی مہم میں حصہ لینے لگا۔

اسے ملے ہوئے سترہ دن ہو گئے تھے۔ میں جس آشنا جگہ پر بھی جاتا تھا، کافی بار کاویٹر، پب کی بارٹینڈر، ریسٹورانٹ کا بیرہ، آرٹ گیلری کا کیپر اور سگریٹوں، مٹھائیوں کی دوکان والی مسز جیمز سن تک سب مجھے بتاتے تھے کہ پورنیما مجھے ڈھونڈ رہی تھی۔ جنگ بند ہو گئی تھی۔ ایوب خان اور شاستری نے تاشقند میں معاہدہ پر دستخط کر لیے تھے، لیکن میں نے اپنی جنگ تیز تر کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اگر شکر گڑھ میں لٹنے والی عصمتوں کا ایوب خان بدل نہ لے سکا تو میں لوں گا۔ سارے بدلے لوں گا، ایک ایک کر کے، 47ء سے لے کر 65ء تک کے سارے بدلے۔ حیدر آباد، جونا گڑھ اور کشمیر تک کے بدلے۔ اگلے روز میں اس یوں ملا کہ جیسے یہ سترہ دن ایک شام میں گزر گئے تھے اور میں دوسرے ہی روز اسے ملنے آ گیا تھا۔ وہ میرے خاندان کے لیے متفکر رہتی جو کہ ہیڈ سلیمانکی کے قریب آباد تھا اور جہاں سے ہندوستانی سرحد بہت قریب تھی۔ وہ میرے والدین کی ہر روز خیریت دریافت کرتی اور میں اسکی اس کمزوری سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا۔ میں نے کہانی گھڑی اور بتایا کہ بم گرنے سے ہمارا گھر تباہ ہو گیا تھا۔ یہ سن کر اس پر سناٹا سا چھا گیا، ہونٹ کانپنے لگے، رنگ سرخ ہو گیا اور موٹے موٹے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے اور پھر مجھ سے لپٹ کر ہچکیوں میں رونے لگی۔ ہچکیاں لیتے ہوئے بڑے کرب سے اس نے مجھ سے پوچھا، ''ہم آپس میں کیوں لڑتے ہیں؟'' اور میں مسکرا دیا۔

میں نے جانچ لیا تھا کہ حملہ محمود غزنوی کی طرح کامیاب نہ ہوگا، ایسٹ انڈیا کمپنی کا طریقۂ واردات زیادہ مؤثر ثابت ہوگا۔ اسی لیے میں نے اس کے لئے پھول، چاکلیٹ اور خوشبوئیں خریدنا شروع کیں۔ ایک دن وہ بڑی آسانی سے شیکسپیئر کے آبائی گاؤں 'سٹریڈفورڈ اپون ایون' چلنے کو تیار ہو گئی۔ پروگرام وہاں شیکسپیئر کمپنی کے پلے دیکھنے اور ویک اینڈ گزارنے کا تھا۔ وہ

میرے بائیں بازو کے ساتھ ہمیشہ یوں لپٹ کر چلا کرتی تھی جیسے وہ مجھ میں سما جانا چاہتی ہو۔ ہمیں گیسٹ ہاؤس میں ڈبل بیڈ کا ایک کمرہ مل گیا تھا۔ ڈبل بیڈ والی سکیم میری ہی تھی اور اسے اس کا اس وقت پتہ چلا جب ہم کمرے میں پہنچے۔ ہلکے سے احتجاج کے بعد اس نے میری یقین دہانیوں اور بناوٹی پیار کے سامنے ہار مان لی۔ پھر اس رات پاکستان نے ہندوستان سے اولمپک میں ہاکی کا گولڈ میڈل جیت لیا، کرکٹ کا ٹیسٹ میچ جیت لیا، کشمیر فتح کر لیا اور دہلی کے لال قلعہ پر اپنا جھنڈا لہرا دیا۔ پورنیما کی یہ پہلی شکست تھی لیکن پھر بھی اگلی صبح اس کے چہرے پر ندامت یا شکست کے کوئی آثار نہ تھے، وہ بڑی پرسکون اور مطمئن سی لگتی تھی اور جس طرح بات بات پر وہ میرے اوپر نچھاور ہوئے جا رہی تھی اس لمحے میں نے یہ اندازہ لگایا کہ شائد میری شدید نفرت کو وہ محبت سمجھتی ہے۔ کہتے ہیں نا کہ محبت اور نفرت دونوں بہت قریب قریب ہیں، اکثر فرق کا پتہ نہیں چلتا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان پر قبضہ کر لیا تھا۔ فیصلہ ہو گیا تھا کہ لوٹ مار ابھی بند ہونی چاہیے، اس وقت تک نہیں جب تک وہ مر نہ جائے یا میرا دل نہ بھر جائے۔ میں لال قلعہ میں روز دربار لگاتا تھا اور اپنی رعایا کی گڑگڑاہٹیں سنتا، اپنی تعریف میں قصیدے سنتا، نیاز نذرانے قبول کرتا اور شکوے شکایت دور کرنے کا وعدہ کرتا۔

اس کے جسم، دل اور دماغ پر میری پوری حکومت تھی اور وہ مجھے پوجا کرنے کی حد تک پیار کر رہی تھی۔ اب وہ مجھے ملنے کے لئے ہر وقت بیتاب رہتی تھی اور آتی تو پھر جانے کا نام ہی نہ لیتی تھی۔ اسے انگلینڈ آئے ہوئے ایک سال ہو چلا تھا اور وہ اب بڑی نکھر گئی تھی۔ رنگ کی سانولاہٹ چھٹتی جا رہی تھی اور خون کے گلابی گلابی رنگ نے اس کی رنگت کو تانبے ایسا بنا دیا تھا۔ اس کا میرے پاس ہونا میرا ایگوفیڈنگ کرتا تھا اور اس لیے میں نے اب بھی اس کو ساتھ رکھا ہوا تھا۔ پھر ایک روز اس نے مجھے بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ یہ خبر میں نے ہزاروں طوطیوں، شہنائیوں، پھلجڑیوں اور پٹاخوں کے چھوٹنے کے شور میں سنی۔ ہندوستان کی فتح مکمل ہو چکی تھی۔ وہ شکست خوردہ مجھ سے شادی کرنا چاہتی تھی اور ہمیشہ میرے ساتھ رہنا چاہتی تھی۔ لیکن ہم دونوں کا نباہ کیسے ہو سکتا تھا؟ ہمارا مذہب مختلف، ہمارے ملک مختلف۔ ''میرے نزدیک ایسی سیاسی یا جغرافیائی حدود یا مذہب کی کوئی وقعت نہیں جو دو انسانوں کو اکٹھے کرنے کی بجائے دور کر دیں۔'' لیکن اس کی ایسی باتیں مجھ پر اثر انداز نہ ہوئیں کیونکہ ایسے لوگ جو دین، مذہب اور حب الوطنی سے عاری ہوں ان پر یقین کون کرے۔ جوں جوں اس کا پیٹ پھولتا گیا میں اس سے دور رہنے لگا کیونکہ میں ڈرتا تھا کہ وہ عدالت سے ہونے والے بچے کا میرے ذمہ خرچہ نہ ڈلوا دے۔ وہ میرے پیچھے پیچھے پھرتی لیکن میرے حیلے بہانوں کو سچ جان کر مجھ سے میرے بدلتے ہوئے رویے کا شکوہ تک نہ کرتی۔

اگلے روز اس نے ہسپتال میں جانا تھا کہ وقت قریب آ گیا تھا۔ میں نے اسے لے جانے کا وعدہ کیا لیکن پھر نہ گیا کیونکہ میں جنگ کے اس اصول پر یقین نہیں رکھتا کہ پہلے توپیں، گولیاں چلا کر انہیں زخمی کرو اور پھر ان کی مرہم پٹی کرو۔ میں اپنا فلیٹ چھوڑ کر کسی اور جگہ منتقل ہونے میں مصروف تھا کہ ہسپتال سے مجھے فون آیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ پورنیما کی طبعیت خراب ہے۔ میں

کئی گھنٹے اسی ادھیڑ بن میں لگا رہا کہ جاؤں یا نہ جاؤں۔ دو تین بار ٹیکسی میں بیٹھ کر اتر گیا اور میٹر کے بنیادی پیسے دے کر واپس آ گیا۔ آخر میں نے جانے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ میں اپنا بچہ دیکھنا چاہتا تھا، میدان جنگ میں جیتا میڈل دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے ہسپتال کر میٹرنٹی وارڈ کی سسٹر سے پورنیما کا پوچھا۔ وہ ڈھلتی ہوئی عمر کی آئرش عورت لمحہ بھر کے لئے مجھے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی، پھر اپنی نیلی دھاری دار یونیفارم کی جیب سے نکال کر ایک خط تھماتے ہوئے بتانے لگی کہ وہ اور بچہ دونوں مر گئے ہیں۔ یہ خبر بجلی کی طرح مجھ پر گری۔ جیسے اپنی تمام تر فتح کے باوجود جنگی اعزاز سے محروم رہ گیا ہوں۔ خط اس نے مرنے سے کچھ دیر پہلے ہی لکھا تھا او سسٹر کو ہدایت کی تھی کہ وہ یہ ضرور مجھ تک پہنچا دے۔ میں نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لفافہ پکڑا اور باہر کو چل دیا۔ کوریڈار میں ردی کی ٹوکری کے پاس رکا۔ میں نے لفافہ کھولنا چاہا لیکن وہ مجھ سے نہیں کھل رہا تھا۔ کیونکہ میں خوف سے تھر تھر کانپ رہا تھا، مجھے پتہ تھا کہ اس لفافے اندر خط نہیں بلکہ ایک ایٹم بم ہے جسے میں نے کھولا تو پھٹ جائیگا، ایک خوفناک دھماکہ ہوگا اور سب کچھ پاش پاش ہو کر زمین پر آ رہے گا۔ میں نے خط کو لفافے سمیت پرزے پرزے کر کے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا اور بھاگ کر ہسپتال کی گھٹن سے باہر کھلی ہوا میں نکل آیا۔

◆◆◆

وفا کی داستاں کہتے ہوئے اب خوف آتا ہے
کسی کو رازداں کہتے ہوئے اب خوف آتا ہے
وہ جس کی شفقتوں پہ ہم بہت مغرور ہوتے تھے
اسی کو مہرباں کہتے ہوئے اب خوف آتا ہے

(اظہر جاوید)

بددُعائیں

یسٰین احمد

اپنے گھر کے سامنے صابرہ نے آٹو رکشا رکوایا۔

اس کے قدموں کے قریب سبزیوں سے بھری پلاسٹک کی باسکٹ رکھی ہوئی تھی اور گود میں اپنے دونوں بچوں کے یونیفارم۔ان چیزوں کو اپنے دونوں ہاتھوں میں سنبھال کر صابرہ نے آٹو رکشا سے اترتے ہوئے کہا۔''بس، دومنٹ رکیئے۔میں آپ کا کرایہ دے رہی ہوں۔''

آٹو والے کی طرف دیکھے بغیر صابرہ اپنے گھر میں داخل ہوئی۔ہال میں ایک طرف اپنا سامان رکھ کر اس نے آٹو رکشا کا کرایہ دینا چاہا تو فوراً اسے یاد آیا کہ وہ پرس آٹو میں بھول گئی ہے۔یکدم اس پر بدحواسی طاری ہوگئی۔وہ تیزی سے باہر نکلی مگر اس وقت تک بہت دیر ہوچکی تھی۔آٹو رکشا گلی کا موڑ کاٹ رہا تھا۔صابرہ وہیں کھڑے کھڑے بے ساختہ چلائی۔''ارے.....رکو..... رکو.....میرا پرس!''

اسلم سکول سے آکر ٹی وی پر کارٹون دیکھ رہا تھا۔تاہم ماں کی آواز سن کر وہ ننگے پاؤں باہر نکلا۔''کیا ہوا امّی ؟''

''وہ آٹو والا.....میرا پرس لے کر چل دیا۔گلی سے آگے جا کر دیکھنا۔''

اسلم اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ہکا بکا ماں کی صورت تکتا رہا۔گلی سے آگے آٹو سٹینڈ تھا جہاں ہر وقت کئی آٹو والے موجود رہتے تھے۔اسلم کسے تلاش کرتا؟اس نے آٹو والے کا چہرہ دیکھا تھا اور نہ آٹو کا نمبر.....آج پہلی تاریخ تھی۔تنخواہ لے کر وہ مارکیٹ آئی تھی۔وہاں اس نے بچوں کے لئے یونیفارم خریدا تھا اور پھر ہفتہ بھر کی سبزیاں۔وہاں سے آٹو رکشا میں گھر آئی تھی۔

صابرہ نے میٹر دیکھا تھا۔صرف بیس روپئے بنے تھے۔لیکن آٹو والا دو تین منٹ میں اس کے تیس دن کی کمائی بیس ہزار روپے لے اڑا تھا۔صابرہ کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے۔اس کا بلڈ پریشر گرتا جا رہا تھا، بے بسی کے عالم میں اندر آکر ہال میں بیٹھ گئی۔اس کی آنکھوں سے اشک رواں تھے۔اس کو اس حالت میں دیکھ کر بڑی بیٹی صائمہ نے ٹی وی بند کر دیا۔دونوں بچے حیرانی سے ماں کو دیکھ رہے تھے۔ساس عصر کی نماز کے بعد حسب معمول وظیفہ پڑھنے میں مصروف تھی۔اس نے جلدی سے اپنا

وظیفہ بند کیا اور بہو کی طرف متوجہ ہوگئی۔ ''کیا ہوا بہو.....؟''

صابرہ نے اپنا سر ساس کے کندھوں سے ٹِکا دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''امّی آٹو سے اترتے وقت میں اپنا پرس وہیں بھول آئی تھی۔ سامان اندر رکھ کر میرے باہر نکلنے سے پہلے ہی وہ اپنا آٹو سٹارٹ کر کے بھاگ نکلا۔ میری پوری تنخواہ تھی اس پرس میں.....''

ساس کے چہرے پر سنّاٹا چھا گیا۔ ''تمہیں پہلے اپنے پرس کا خیال رکھنا چاہیے تھا۔''

''ہاں، امّی غلطی ہوگئی۔''

صابرہ نے سسکیوں کے درمیان اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ عمر کی ایک مخصوص منزل پر پہنچنے کے بعد آدمی کے سوچنے کی نہج بدل جاتی ہے۔ وہ اپنی بھول چُوک کو بھی کسی ان دیکھی قوتوں کی کارستانی سمجھتا ہے۔ ساس کڑوے لہجے میں بولی۔ ''میں پہلے ہی کہتی تھی یہ مکان اچھا نہیں ہے۔ یہاں آتے ہی اکرم کی نوکری گئی اور اب بڑا نقصان.....!''

نوکری صرف اکرم کی ہی نہیں گئی تھی۔ اس شہر کے، اس ملک کے بلکہ دنیا کے بیشتر ممالک کے ملازمین اپنی نوکریوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ بیروزگاری عالمی سطح پر آئی تھی۔ وہ ملازمین جو انفارمیشن اور ٹکنالوجی سے وابستہ تھے اسی بیروزگاری کی لپیٹ میں آ گئے تھے۔

اکرم سافٹ ویئر انجینئر تھا۔ اور ہر ماہ ستر ہزار تنخواہ اٹھاتا تھا۔ ان دونوں کو اپنی ازدواجی زندگی کے 14,13 سال میں کبھی پیسے کی تنگی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ اکرم نے چار، یا پانچ سال اپنی تنخواہ پس انداز کی اور ایک خوبصورت سا مکان خرید لیا۔ صابرہ نے اپنے زیورات بیچے، جی پی ایف سے قرض لیا اور مکان کا رنگ روپ بدل دیا۔ پرانے کرایہ کے مکان کے ساتھ ضروریات کا پرانا سامان بھی ہٹا دیا گیا۔ ذاتی مکان میں ہر چیز نئی آ گئی۔ ڈبل ڈور کا فریج، 32 انچ کا ایل سی ڈی، آٹو میٹک واشنگ مشین، ساگوان کا فرنیچر، آرام دہ بستر اور خوبصورت کراکری کا سامان۔ اگر کوئی چیز نہیں بدلی تھی تو وہ تھی پانچ سالہ بائیک۔ ارادہ تھا کہ تین چار ماہ کے بعد بائیک کی بجائے فور وہیلر خرید لی جائے۔ لیکن ان کے منصوبوں پر پانی پھر گیا۔ چشم زدن میں سارے خواب تہس نہس ہو گئے۔ وہ انہونی ہوئی جس کے بارے میں اکرم نے سوچا بھی نہ تھا۔

جس ماہ میں وہ نئے ذاتی مکان میں منتقل ہوئے اسی ماہ اکرم کی نوکری جاتی رہی۔ ماں نے تو اپنی چھاتی پیٹ لی اور کہتی رہی کہ نیا مکان منحوس ہے۔ مگر اکرم جانتا تھا کہ عالمی سطح پر جو معاشی بحران آیا ہے اس کی زد میں وہ اکیلا نہیں لاکھوں افراد شامل ہیں۔ صابرہ کی ملازمت چل رہی تھی اس لئے گھر کے کاروبار پر کوئی اثر نہیں پڑا۔ ایک سال سے معمول کے مطابق گھر چل رہا تھا۔ لیکن آج کی افتاد پریشان کن تھی۔

اچانک صابرہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ساس نے تشویشناک انداز میں پوچھا۔ ''اب کیا کرنا ہے؟''

''پولیس اسٹیشن جاؤں گی اور رپورٹ لکھواؤں گی۔'' صابرہ نے جواب دیا۔

ساس نے کہا۔ ''کوئی ضرورت نہیں ہے، پولیس والے کون سا تیر مارتے ہیں۔ الٹا ہماری ناک میں دم کردیں گے۔ اکرم کو آجانے دو۔''

اکرم آیا۔ سہمے ہوئے بچوں کی خاموشی، ماں کا فکرمند چہرہ اور بیوی کی اڑی اڑی رنگت دیکھ کر اکرم کا ماتھا ٹھنکا کہ یقیناً کوئی انہونی ہوئی ہے۔ ماں نے سب کچھ بتا دیا تو پہلے وہ کچھ لمحوں تک خاموش رہا اور پھر ایک زوردار قہقہہ لگایا۔ ''اتنی سی بات پر آپ سب پریشان ہیں۔ بڑے بڑے لوگ ریس میں ایک گھوڑے پر اتنی رقم ہار جاتے ہیں تو ان کی پیشانی پر کوئی بل نہیں آتا۔ جوے کی میز پر اتنی رقم چلی جاتی ہے تو مسکراتے رہتے ہیں۔ اس دور میں بیس ہزار کی کوئی اہمیت ہے؟''

''ہم اتنے بڑے نہیں ہوئے ہیں اور نہ ہمارے پاس حرام کی کمائی آتی ہے۔'' صابرہ روہانسی ہوکر بولی۔ ''ایک ماہ تک ہمارے گھر کا خرچ چلتا تھا اس رقم سے.....!''

اکرم بدستور ہنستا رہا۔ اس کے ماتھے پر کوئی شکن نہیں تھی۔ اس نے صابرہ سے کہا۔ ''اس واقعہ کو بھول جاؤ۔ پولیس میں رپورٹ لکھوانے سے بھی کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ فریش ہوجاؤ اور میرے لئے چائے بناؤ۔''

اکرم نے اتنی تسلیاں دیں تو صابرہ قدرے بحال ہوئی اور اٹھ کر کچن میں آ گئی۔ چائے بنا کر لے آئی تو اس نے دیکھا اکرم ٹی وی پر چینل بدل رہا ہے۔ ریموٹ کنٹرول پر اس کی انگلیاں مسلسل متحرک تھیں جو غماز تھیں کہ وہ بھی اندر سے بے چین ہے۔

رات کو بستر پر نیم دراز ہوکر اکرم کسی کتاب کے مطالعہ میں محو تھا۔ صابرہ اس کی طرف پشت کئے سو رہی تھی۔ اچانک اکرم نے محسوس کیا کہ صابرہ نیند میں بھی سسک رہی ہے۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ صابرہ کی بانہہ پر رکھا اور اس کو اپنی طرف گھمایا۔ صابرہ جاگ رہی تھی۔ لیکن اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

اکرم نے کتاب بند کردی۔ ''صابرہ میں نے کہا نا اس واقعہ کو بھول جاؤ۔ پھر رو رو کر کیوں اپنے آپ کو ہلکان کررہی ہو!''

''کیسے بھول جاؤں؟'' صابرہ روتے روتے ہوئے بولی۔ ''یہ مہینہ کیسے چلے گا۔''

''تم اس کی فکر مت کرو۔ میں کوئی انتظام کروں گا۔''

صابرہ کے اندر کی عورت باہر نکل آئی۔ ''اس نے میرے معصوم بچوں کا حق چھینا ہے۔ اس کا آٹو الٹ جائے، اس کی ٹانگ ٹوٹ جائے، خدا کرے اس کے بچے دانے دانے.....!''

ممکن تھا، بدعاؤں کا سلسلہ اور جاری رہتا مگر اکرم نے اس کی مہلت نہیں دی۔ اس نے صابرہ کے گیلے ہونٹوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے کہ منتشر ذہن کو سکون بخشنے کے لئے یہ عمل بھی کارگر ثابت ہوتا ہے۔

دوسرے دن آفس میں جس نے بھی سنا حیرت اور افسوس کا اظہار کیا۔ اس کی کولیک گیتا جو روز آٹو میں آفس آتی اور جاتی تھی غصہ سے بولی۔ ''اس شہر کے تمام آٹو والے اسی قسم کے ہیں۔ چور، اُچکے، بدمعاش۔ اس کا تم سے کرایہ لیے بغیر چل دینا خود اس بات کا ثبوت ہے کہ اس نے تمہارا پرس دیکھ لیا تھا۔''

صابرہ دن بھر پریشان رہی۔ اب اس کے سامنے مہینے بھر کی ضروریات سے نمٹنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ دونوں کا بینک بیلنس NIL تھا۔ گھر میں روزمرہ کی ضروریات کے لئے جو پیسے رکھے تھے وہ سینکڑوں میں تھے۔ کسی دوست یا رشتہ دار سے قرض لینے کے دونوں عادی نہیں تھے۔ صابرہ دن بھر ذہنی طور پر الجھی رہی۔ شام کو آفس سے آئی تو اکرم گھر پر موجود تھا۔ اس نے دونوں بچوں کی فیس ادا کر دی تھی۔ بجلی، پانی اور فون کا بل بھی ادا کر دیا تھا۔ کچن میں اشیائے خوردنی بھی موجود تھیں۔

صابرہ متوحش نظروں سے اسے گھورتی رہی۔ معاً ایک خیال اس کے دماغ میں آیا۔ وہ سرعت سے گھر سے باہر نکل آئی۔ کمپاؤنڈ میں وہ جگہ خالی دکھائی دی جہاں روز اکرم کی بائیک کھڑی رہتی تھی۔ دکھ کی ایک لہر اس کے اندرون میں دوڑ گئی۔ اس نے اکرم سے پوچھا۔ ''بائیک کہاں ہے؟''

''پرانی ہوگئی تھی اس لئے بیچ دی۔'' اکرم نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔

''اور اب آپ بسوں میں دھکے کھاتے پھریں گے؟

''نہیں۔'' اکرم مسکراتے ہوئے بولا۔ ''آٹو میں پھروں گا۔ اس شہر میں آٹو والوں کی کمی نہیں۔''

صابرہ کا موڈ پھر ایک بار خراب ہوگیا۔ بے اختیار اس کے دل سے اس آٹو والے کے لئے بددعائیں نکلنے لگیں جو اس کا نوٹوں سے بھرا ہوا پرس لے کر چل دیا تھا۔

وہ مہینہ جیسا تیسا گذر گیا۔

اگلی ماہ کی پہلی تاریخ کو تنخواہ ملی تو پریشانیاں خود بخود کم ہوتی گئیں۔ اس کے بعد حالات تیزی سے بدلنے لگے۔ اکرم کو ایک بڑی فرم میں ملازمت مل گئی تھی۔ تنخواہ نسبتاً کم تھی لیکن سہولتیں بہت زیادہ۔ فرم کی جانب سے کار بھی ملی تھی۔ اب صابرہ کو آفس جانے کے لئے بس یا آٹو کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اکرم اسے آفس پر ڈراپ کر دیتا اور شام کو اپنے ساتھ لے آتا تھا۔ لیکن صابرہ اس حادثے کو بھول نہیں سکی۔ جب بھی اسے اپنے پرس کا خیال آتا وہ بے اختیار آٹو والے کو بددُعائیں دینے لگتی تھی۔

تیرہ، چودہ ماہ گذر گئے۔

وہ اتوار کو صبح کے وقت ٹی وی پر اپنی پسندیدہ پروگرام ''کھانا خزانہ'' دیکھ رہی تھی۔ اس سے ایک لڑکی ملنے آئی۔ عمر بارہ، تیرہ سال کے درمیان ہوگی۔ وہ جوانی کی منزل میں داخل ہو رہی تھی۔ ایک بڑے سے دوپٹے میں لڑکی نے اپنے آپ کو چھپا رکھا تھا۔ اس نے بڑے احترام سے صابرہ کو سلام کیا اور پھر ایک پرس اور ایک چٹھی اس کے حوالے کی۔ صابرہ نے نظر پڑتے ہی پرس کو

پہچان لیا۔اس کا اپنا پرس تھا جو اس وقت چھوٹے بڑے نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔صابرہ نے حیرت کے عالم میں چٹھی پڑھی۔ٹوٹی پھوٹی عبارت اردو زبان میں تھی۔

''بہت پہلے میں آپ کا پرس لے کر چل دیا تھا لیکن میرا ضمیر متواتر مجھ کو ملامت کرتا رہا۔اگر اس وقت وہ حرکت نہ کرتا تو میری بیٹی جو اس وقت آپ کے سامنے ہے،شاید زندہ نہ رہتی۔اس کے آپریشن کے لئے مجھ کو پیسوں کی سخت ضرورت تھی۔روپیہ روپیہ جوڑنے میں مجھ کو اتنے مہینے لگے۔آج آپ کو پیسے لوٹا رہا ہوں۔ہو سکے تو اس گناہگار کو معاف کر دیں۔''

صابرہ نے لڑکی کو اندر بلا کر بٹھایا۔اس کو چائے وغیرہ پینے کے لئے کہا،لڑکی نے بہت ہی مہذب انداز میں انکار کر دیا۔ صابرہ نے ایک مختصر سی تحریر لکھی۔تحریر اور نوٹوں سے بھرا ہوا پرس لڑکی کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔''یہ چٹھی اور پیسے اپنے ابّا کو دے دینا اور ذرا احتیاط سے جانا۔''

لڑکی نے اس کو سلام کیا اور اپنے دوپٹے میں چٹھی چھپا کر باہر نکل گئی۔صابرہ نے لکھا تھا۔

''اب ان پیسوں کی مجھ کو ضرورت نہیں رہی۔پیسے اپنی بیٹی کے نام پر قومی بچت کی کسی سکیم میں جمع کرا دو۔ اس کی شادی پر کام آئیں گے۔''

اب وہ ایک غیر معمولی اضطراب کا شکار ہو گئی تھی۔آٹو والے نے تو پیسے لوٹا کر اپنا ضمیر کا بوجھ ہلکا کر لیا تھا۔لیکن اس نے جو بددُعائیں دی تھیں وہ اس کے اپنے ضمیر پر ڈیرہ جمائے بیٹھی تھیں۔

◆◆◆

وہ اپنے گھر میں خوشیوں کی ردا تانے ہوئے ہو گی
یہاں کوئی غموں کی داستاں کہنے کو بیٹھا ہے
اُسے فرصت ملے تو کاش اتنا دیکھ لے آ کر
یہ دل بیتاب ہے، تازہ ستم سہنے کو بیٹھا ہے

(اظہر جاوید)

سعید احمد اختر

O

یہ مختصر سی کہانی مرے سفر کی ہے
کہ ارضِ گیسو و رخسار میں بسر کی ہے

نہیں ہے خوف کوئی زیست کے اندھیروں کا
کہ میں نے آنکھ تری روشنی سے تر کی ہے

زیادتی بھی جفا بھی ستم بھی ہے لیکن
کہوں گا کیسے کسی سے کہ بات گھر کی ہے

گلوں کو بھول گیا ہو یہ حادثہ شاید
کہ خار سے مری ہنس بول عمر بھر کی ہے

یہ اور بات کہ وہ مجھ سے کہہ گئی کیا کیا
کبھی کبھی تو مرے حال پر نظر کی ہے

میں کیسے چھوڑ کے جاؤں وہ گھر، وہ در اختر
قسم جو لی ہوئی میں نے کسی کے سر کی ہے

OOO

حسن عسکری کاظمی

O

چارہ گر ہے نہ کوئی درماں ہے
جینا مشکل ہے مرنا آساں ہے

سنگ ریزے ہیں اپنی مٹھی میں
آنکھ پتھر ہے جسم بے جاں ہے

کس نے دہشت کو دی ہوا سوچو
کون دنیا میں ایسا ناداں ہے

ایک انساں کی جان لی جس نے
لوگ کہتے ہیں وہ بھی انساں ہے

موت رقصاں ہے سامنے ہر دم
زندہ رہنے کا یہ بھی ساماں ہے

کوئی بچ کر نکل گیا ہو گا
دستِ قاتل میں تیغِ عریاں ہے

مسکراہٹ ہے جن کے چہروں پر
سنگِ نفرت بھی زیرِ داماں ہے

بند کوچے میں زندگی گزری
رہبروں کا یہ ہم پہ احساں ہے

شہر دل تو اُجڑ گیا لیکن!
ہم وہاں ہیں جہاں بیاباں ہے

دور اُفق پر کھلی فضاؤں میں
کوئی پرچم ہے یا گریباں ہے

کیسے ٹھہریں غزل سرا میں حسن
رات سر پر ہے دل پریشاں ہے

بسمل صابری

O

خواب کی جھیل پہ اُتری جو کرامات گئی
دامنِ عشق میں خیرات تھی خیرات گئی

ہجر راتوں میں تِری یاد کی بارات گئی
رُوح کی قید میں اِک چاندنی سی رات گئی

وہ جو نظروں سے بھی چُھو لے تو قیامت ہو بپا
رقص کرتی ہوئی بِن اَبر کے برسات گئی

جھلملا اُٹھتے تھے جن سے تیری یادوں کے چراغ
ذہن کے پردے میں کیا بات تھی، وہ بات گئی

عُمر بھر جس نے تجھے طرزِ تخاطب بخشا
دل کا رشتہ بھی گیا درد کی سوغات گئی

اِک نیا بابِ سُخن کھول دیا ہے جس نے
بس رہی تھی تیرے اندر جو کوئی ذات گئی

کوئی جگنو کوئی تارا نہ کوئی آئینہ
ذائقہ دے نئی غزلوں کو طلسمات گئی

تو اگر دوست ہے میرا تو مرا حال بھی دیکھ
اب تو وہ تشنگیٔ زیست گئی، گھات گئی

رونقِ بزمِ نگاراں تھی وہ چہکار کہاں
کل تلک بات جو بسمل میں تھی وہ بات گئی

وصی شاہ

O

کیا کہیں تجھ سے کہ کِس کِس کے ستم ہیں، ہم ہیں
کچھ ترے کچھ تری دنیا کے کرم ہیں، ہم ہیں

تو نے پوچھا ہے تو احوال بتا دیتے ہیں
بس تری یاد ہے اور آخری دم ہیں، ہم ہیں

یہ ہمارا ہے کسی اور کا لاشہ تو نہیں
کس لیے آنکھ کے گوشے ترے نم ہیں، ہم ہیں

ساقیا حفظِ مراتب کا ذرا دھیان رہے
جام لگتا ہے کہ معیار سے کم ہیں، ہم ہیں

جن کو مجنوں بھی کیا کرتا ہے جھک کر آداب
گرچہ اس طرح کے عاشق بڑے کم ہیں، ہم ہیں

ہائے کیا جان کے دروازہ نہ کھولا اس نے
ہم پکارا ہی کیے یار! یہ ہم ہیں، ہم ہیں

کیسے کیسے وہ کیا کرتا ہے وعدے ہم سے
صبح سے شام تلک اس کے بھرم ہیں، ہم ہیں

ساقیا ہم سے بھی دیرینہ مراسم ہیں ترے
یہ جو محرومِ قدح غرقِ الم ہیں، ہم ہیں

غیر کے دم سے ہے رونق بھی چراغاں بھی وصیؔ
تیری محفل میں اگر سبز قدم ہیں، ہم ہیں

ظفر علی راجا

O

نہ ہم، اب بھی اگر بولیں گے، اِک دن
تو پھر دیوار و در بولیں گے، اک دن

زباں پر خوف کے پہرے رہے تَو
یہاں نیزوں پہ سر بولیں گے، اک دن

اگر کہسار چُپ سادھے رہیں گے
تو آخر بحر و بر بولیں گے اک دن

چُھپا پاؤں گا کیسے عیب اپنے
مِرے شام و سحر بولیں گے اک دن

زبانِ خشت، توڑے گی خموشی
مِری بستی کے گھر بولیں گے اک دن

اگر سردار لب بستہ رہیں گے
تو پھر آشفتہ سر بولیں گے اک دن

پرندے بول نہ پائے تو راجا
قفس میں بال و پَر بولیں گے اک دن

شاہ محمد سبطین شاہجہانی

O

بسا ہے جب سے تصّور ترا خیالوں میں
ہے مِرے عشق کا چرچا پری جمالوں میں

تری مثیل کی صورت گہر نہ گل نہ قمر
عبث تلاش کیا ہے تجھے مثالوں میں

مرے جنوں کے حواشی کمالِ حسن کے ساتھ
مِلے کتابِ محبت کے سب حوالوں میں

نہ دشت میں اِسے آسودگی نہ رمنوں میں
غزالِ عشق اچھوتا ہے سب غزالوں میں

ہماری تیرہ نصیبی کو نور ملتا ہے
تمہارے ذکرِ کرم بار کے اُجالوں میں

جو رنگ و نور ترے سنگِ آستاں پر ہے
نہ معبدوں کو میسّر نہ ہے شوالوں میں

اگرچہ خاسر و قاصر ہوں آج میں سبطین
ابد کا نور ہے روشن مرے کمالوں میں

سلیمان خمار(انڈیا)

O

صدف کی کوکھ سے نکلے ہوئے گہر کی طرح
ہر اک سخن ہے مرا حرفِ معتبر کی طرح
وہ بستیوں کی طرف کیوں سفر نہیں کرتی
وہ اک لکیر اُفق پر ہے جو سحر کی طرح
یہ کچھ تو ہے جو جگاتا ہے رات بھر ہم کو
یہ کچھ تو ہے جو دلوں میں بسا ہے ڈر کی طرح
نشانِ راہ، نہ سایہ، نہ منزلوں کا پتہ
ہماری زیست ہے صحراؤں کے سفر کی طرح
تمہارا ساتھ میسّر رہا ہمیں جب تک
جھلستی دھوپ بھی تھی سایۂ شجر کی طرح
یہ کس مقام پہ پہنچا ہے کاروانِ حیات
یہاں تو شام بھی لگتی ہے دوپہر کی طرح
تری گلی سی نہ کوئی گلی ہے زیرِ فلک
نہ رہگزر ہے کوئی تیری رہگزر کی طرح
وفا شعار بہت ہے تمہارے ہجر کا غم
تمام عمر رہا ساتھ ہم سفر کی طرح
ہمارے دور کی فرہنگ ہی الگ ہے میاں
لکھا ہے جس میں ہر اک عیب کو ہنر کی طرح
خمارؔ شہر میں کس کو سُناؤں تازہ غزل
نظر تو آئے کوئی صاحبِ نظر کی طرح

کرامت بخاری

O

سمندر ہوں یہ سب سیلاب میرے
مرے چاروں طرف گرداب میرے

خرابوں میں شکستہ مقبرے ہیں
کہ بکھرے ہیں خیال و خواب میرے

کوئی دیوار گریۂ ڈھونڈتا ہوں
کہ دریا ہو چلے پایاب میرے

کبھی تو پھل سرِ شاخِ تمنّا
کبھی تو مل مجھے مہتاب میرے

مری محروم آنکھیں ڈھونڈتی ہیں
کہاں ہیں وہ چمن شاداب میرے

میں تنہا ہوں سمندر کے سفر میں
کنارے تک گئے احباب میرے

تری نظروں میں بے قیمت ہی ٹھہرے
مرے آنسو دُرِ نایاب میرے

رفیع الدین ذکی

O

جہل و گمراہی کے دم سے آ گہی کا ہے وجود
جیسے ظُلمت کے مقابل روشنی کا ہے وجود

چاند تارے رونق دنیائے آب و گل سہی
آدمِ خاکی سے قائم زندگی کا ہے وجود

میرے دل کے آئینے میں تُو جو ہو جلوہ فگن
مَیں بھی یہ سمجھوں گا جہاں میں روشنی کا ہے وُجود

یہ نہ ہو تو دوستی اک حرفِ بے مفہوم ہے
دشمنی کے دم سے گویا دوستی کا ہے وجود

اِس حقیقت کا دلِ گلچیں کو کب احساس ہے
باغباں کے خُونِ دل سے تازگی کا ہے وجود

دوستی کا ہاتھ میں پرچم اُٹھائے دہر میں
مَیں وہاں پہنچا جہاں بھی دُشمنی کا ہے وجود

زندگی کے رازِ پنہاں تک پہنچ جائے گا تُو
اے ذکی! سینے میں تیرے گر خُودی کا ہے وجود

صفدر صدیق رضی

O

ریزہ ریزہ ہوں نہیں اور بکھر سکتا میں
اب کوئی اور محبت نہیں کر سکتا میں

غیر ممکن تھا یہ میرے لئے اُس شخص کے بعد
ایک پل اور کسی دل میں ٹھہر سکتا میں

کس لئے جینا ہے اور کس کے لئے مرنا ہے
مَیں گذر جاتا اگر جاں سے گذر سکتا میں

میں کہیں نخلِ ثمر بار ہُوا کرتا اگر
صرف سرِ شاخ تہہِ خاک اُتر سکتا میں

مُجھ پہ بھی تنگیٔ دامن کی صداقت کھلتی
اپنے پھیلے ہُوئے دامن کو جو بھر سکتا میں

OOO

عمرزمان

O

اُس کی آمد کا ہُوا ایسا اثر بے ساختہ
اُٹھ گئی اُس کی طرف سب کی نظر بے ساختہ

یہ کہانی سوچ کر لکھی نہیں جاتی کبھی
دل کو ہوتی ہے محبت کی خبر بے ساختہ

چھیڑتی ہے جب کسی نوخیز پنچھی کو ہوا
تولنے لگتا ہے وہ اُڑنے کو پر بے ساختہ

فکرِ تازہ کے مقابل تیرگی ٹھہرے گی کیا؟
توڑ دیتی ہے فسوں شب کا سحر بے ساختہ

آہ جب للکار بنتی ہے کسی مظلوم کی
ٹوٹ پڑتا ہے سپاہِ جبر پر بے ساختہ

خشک پتوں نے اُٹھا کر ہاتھ مانگی تھی دُعا
بارور ہونے لگی شاخِ ثمر بے ساختہ

دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے جانے کس لئے
یاد آ جاتا ہے جب کوئی، عمر، بے ساختہ

زمان کُنجاہی

O

مجھے طلب کے وہ کن جنگلوں میں چھوڑ گیا
کہ میرا ساتھ کٹھن راستوں میں چھوڑ گیا

میں ایک عمر سے کرتا ہوں انتظار اُس کا
وہ اُلفتوں کے عجب مرحلوں میں چھوڑ گیا

اُسی کو دیکھتی رہتی ہیں رات بھر آنکھیں
وہ اپنا عکس مرے آئینوں میں چھوڑ گیا

کبھی وہ آئے گا پھر سے بہار کی صورت
وہ اپنے پیار کی خوشبو دلوں میں چھوڑ گیا

بڑھے ہیں فاصلے کچھ اور اُس کے جانے سے
عجیب شخص تھا کن مرحلوں میں چھوڑ گیا

پھر آج کس کے لئے تو اُداس بیٹھا ہے
زمان کون تجھے اُلجھنوں میں چھوڑ گیا

OOO

نسیمِ سحر

O

لمحۂ بے ثبات سامنے ہے
اِک نئی کائنات سامنے ہے
ایک لمحے کے قرب کی خاطر
ہجر کی ایک رات سامنے ہے
آئنہ توڑ بھی دیا مَیں نے
پھر بھی اپنی ہی ذات سامنے ہے
جیتتا جا رہا ہوں مَیں، لیکن
ایسا لگتا ہے، مات سامنے ہے
ہر کسی سے اُلجھ رہا ہوں مگر
کوئی اپنی ہی بات سامنے ہے
پھر مُجھے دشت کا سفر درپیش؟
پھر ترا التفات سامنے ہے
موت آئی تو یوں لگا مجھ کو
جیسے یومِ نجات سامنے ہے
کتنی اچھی رہی دروں بینی!
منظرِ شش جہات سامنے ہے
جس سے باہر چلا گیا تھا میں
پھر وہی کائنات سامنے ہے
گزر آیا ہوں پُل صراط سے مَیں
اِک نیا پُل صراط سامنے ہے
رگ و پَے میں ہے روشنی کتنی
وُہ ہے یا چاند رات سامنے ہے!
فیصلہ ہو نہیں سکا اب تک
موت ہے یا حیات سامنے ہے
اتنا لکھا ہے اپنے بارے میں!
اور ابھی کربِ ذات سامنے ہے
حالِ دِل اُس سے مَیں کہوں، لیکن
اس کی بھی نفسیات سامنے ہے
زہر کے جام کی طلب ہے نسیم
جب سے آبِ حیات سامنے ہے

انوار فیروز

O

حیف ہے اس نادانی پر
ریت کا گھر اور پانی پر
صحرا بھی حیران ہوا
شہروں کی ویرانی پر
اوپر والا حیراں ہے
اس طرزِ سلطانی پر
کیسے شہر میں امن رہے
چور ہوں جب نگرانی پر
اس کا جرم تو لکھا ہے
صاف اس کی پیشانی پر
کون بھلا مامور ہوا
سوچوں کی نگرانی پر
گلچیں خود بھی روتا ہے
گلشن کی ویرانی پر
ہم کو رونا آتا ہے
شاہوں کی نادانی پر
یزداں ہنستا رہتا ہے
کارگہِ انسانی پر
رُک جاؤ انوار ذرا
دریا ہے طغیانی پر

وصی مکرانی واجدی (نیپال)

O

اک بشر ہے کس بلندی کے سفر پر دیکھئے
جلتے ہیں جبریل کے بھی جس جگہ پر دیکھئے

ہم جلائے کب سے بیٹھے ہیں اُمیدوں کا چراغ
نامہ کب لاتا ہے آقا کا کبوتر دیکھئے

میں ہوں بیمار محبت، میری پرسش کے لئے
کب مرے سرکار آتے ہیں، مرے گھر دیکھئے

وسوسہ اُٹھا اگر دل میں ذرا تنقیص کا
تہمتیں لگ جائیں گی ایمان کے سر دیکھئے

اعترافِ حق زباں رکھ کر نہ کر پایا مگر
بے زباں حق بولتا مٹھی میں کنکر دیکھئے

آپ تو بس تلملا اٹھے ہیں اک آزار سے
کیسے پی جاتا دُکھوں کا ہے وہ ساگر دیکھئے

زندگی میں آپ کو ہو گی نہ دشواری کبھی
پاؤں پھیلانے سے پہلے اپنی چادر دیکھئے

زندگی میں اس کو ہونی ہے پریشانی بہت
دل میں جس کے آرزوؤں کا ہے لشکر دیکھئے

اے وصؔی ہم نے سنا ہے مئے سے غم ہوتا ہے دور
آزمانے کیلئے تھوڑی سی پی کر دیکھئے

ثمینہ سیّد

O

دل دشت کی صورت تھا سمندر ہوا کیسے؟
سر سبز خزاں زاد مقدّر ہوا کیسے؟

اک عمر کسی پل جو میرے ہاتھ میں آیا
وہ خواب سا احساس مسخّر ہوا کیسے؟

پھرتی تھی تمنّاؤں بھری شال سمیٹے
پھر جذبۂ گمنام اُجاگر ہوا کیسے؟

مدّت سے یہ اُلجھی ہوئی گُتھی نہیں سلجھی
وہ مجھ میں سمایا تھا تو بے گھر ہوا کیسے؟

چھاؤں میں ڈھلا کیسے تمازت بھرا موسم؟
پھولوں سے بھی نازک میرا پیکر ہوا کیسے؟

اک راز جو ہمراز رہا برسوں ثمینہؔ
اب سوچتی ہوں فاش جہاں پر ہوا کیسے

OOO

حیاتؔ رضوی امروہوی

O

نئے ہیں لوگ نیا سلسلہ الم کا ہے
جو تیر کر نہ سکے وار وہ قلم کا ہے

علائقِ رہِ دُنیا سے کھینچئے دامن
صعودِ طائرِ جاں ہے سفر عدم کا ہے

بھرم جو ٹوٹ گیا، زندگی ہے لاحاصل
تعلقات میں پردہ اسی بھرم کا ہے

متاعِ علم و ہُنر، داستانِ پارینہ
یہ مرثیہ ہے عرب کا، یہی عجم کا ہے

جو کل تلک تیری محفل میں ہم کو حاصل تھا
ملال آج اُسی جاہ کا، حشم کا ہے

وہ تختِ دارا و جمشید ہو کہ تختۂ دار
بلند و پست میں بس فاصلہ قدم کا ہے

OOO

حیات رضوی امروہوی

O

سایہ ہے، ستارہ ہے، چھلاوہ تو نہیں ہے
اے رشکِ تصور، ترا چہرہ تو نہیں ہے

دل ہے جو بہت سوچ کے بچھتا ہے کسی جا
یہ واعظِ ناداں کا مصلّے تو نہیں ہے

بچوں سے جو بنواتی ہے مٹی کے گھروندے
کھوئی ہوئی جنت کی تمنّا تو نہیں ہے

پلکوں میں بسانا تھا غبارِ رہِ طیبہ
طیبہ ہے، دیارِ جم و کسریٰ تو نہیں ہے

جب گنبدِ خضرا پہ نظر پڑتی ہے رضوؔی
دل پوچھے ہے یہ عرشِ معلیٰ تو نہیں ہے

OOO

آفتاب خان

O

محبتوں کے تو آثار ہی جلا ڈالے
ہوائے دشت نے رخسار ہی جلا ڈالے

مری چُبھن وہ ستم گر تو جانتا ہی نہیں
کہ جس کے پیارے میں گھر بار ہی جلا ڈالے

مَیں پانیوں میں یہ کشتی اُتار دوں کیسے
خود اپنے ہاتھ سے پتوار ہی جلا ڈالے

خوشی کے پھول سے لمحے بہت بچائے مگر
غموں کی دھوپ نے ہر بار ہی جلا ڈالے

تجھے ہے فکر فقط اپنی چند کلیوں کی
سمومِ وقت نے گلزار ہی جلا ڈالے

کچھ اس قدر تھے ملے رنج اِن کی چھاؤں سے
بھری بہار میں اشجار ہی جلا ڈالے

وہ آفتابؔ بھی نکلا تو بھیرویں نہ سُنی
کہ ساز توڑ دیے، تار ہی جلا ڈالے

فرزانہ جاناں

O

گُلوں سے رنگ شجر سے ثمر ہی جائیں گے
جو آ گئے ہیں یہ طوفاں بکھر ہی جائیں گے

میں تیری یاد کو دل میں کہاں تلک رکھوں
یہ ماہ و سال یہ دن بھی گزر ہی جائیں گے

کسی کو ڈھونڈتی پھرتی ہوں میں زمانوں میں
یہ رات اور یہ دِن بھی گذر ہی جائیں گے

یقیں ہے ہاتھ کی اِک اِک لکیر بدلے گی
خراب ہیں جو زمانے سُدھر ہی جائیں گے

خیال ہے کہ گیا وقت لوٹے پھر جاناںؔ
زوالِ زیست کے یہ دِن گزر ہی جائیں گے

OOO

عظیم راہی

O

جو پہلے دن تھی، ہم وہ آج تک محسوس کرتے ہیں
تمہارے نام پر دل میں کسک محسوس کرتے ہیں

نظر آتا نہیں وہ چاند سا چہرہ تو ہم اکثر
ستاروں میں اُن آنکھوں کی چمک محسوس کرتے ہیں

نسیمِ صبح، پھولوں سے لدی شاخیں، سنہری دھوپ
سبھی اُن کے پسینے کی مہک محسوس کرتے ہیں

محبت دونوں جانب ہے مگر ہم ایک مدّت سے
تنِ تنہا یہ دردِ مشترک محسوس کرتے ہیں

اُدھر مستانہ وار اُن کے قدم پڑتے ہیں محفل میں
اِدھر ہم اپنے سینے میں دھمک محسوس کرتے ہیں

کسی کا اجنبی لہجہ بہت تکلیف دیتا ہے
مگر ہم شکوہ کرنے میں ہتک محسوس کرتے ہیں

سُنا ہے آسمانوں پر ہمارے بعد اے راہیؔ
کمی سے حور و غلمان و ملک محسوس کرتے ہیں

عبدالجبار اثر

O

شوق سے انحرافِ وفا کیجئے
حق محبت کا کچھ تو ادا کیجئے

عشق کا حوصلہ تو بہت ہے مگر
حسن دامن کشاں ہو تو کیا کیجئے

بات چلمن میں چُھپنے سے چھپتی نہیں
سامنے آیئے سامنا کیجئے

وہ ملیں بھی تو خلوت میں، کس طور پر
بے وفائی کا ان سے گلہ کیجئے

آئینہ ٹوٹ جائے تو کچھ غم نہیں
دل اگر ٹوٹ جائے تو کیا کیجئے

جانِ جاں بن گئی یاد جس شخص کی
دل سے کیسے اسے اب جدا کیجئے

قتل و غارت گری ہے اثرؔ چار سُو
عافیت کی خدا سے دعا کیجئے

کرنل مجید ملک

.....4.....

شفیع عقیل

جیسے ہی میں کمرے میں گیا، وہ کرسی کو تھوڑا آگے کرتے ہوئے بولے۔

''آؤ.....عزیزم بیٹھو۔''

''تم لاہور تو جاتے رہتے ہو.....؟''

میں نے عرض کیا۔''ملک صاحب! سال میں ایک بار تو ضرور جاتا ہوں۔فرمایئے کیا کام ہے؟''

اس پر کہنے لگے۔''مجھے بُلھے شاہ کا دیوان ''قانونِ عشق'' چاہیے۔وہ کہیں سے لانا!''

میں نے بتایا کہ ''بُلھّے شاہ کے کلام کے مجموعے تو ایک سے زائد ناشروں نے شائع کیے ہیں، میں کوئی اچھا سا ایڈیشن دیکھ کے لے آؤں گا۔'' مگر انہوں نے کہا۔''نہیں، مجھے اس کا عام دیوان نہیں چاہیے۔صرف مولوی انور علی رہتکی کا ''قانونِ عشق'' درکار ہے۔وہ تلاش کر کے لانا۔''

میں نے اس وقت لانے کی ہامی تو بھر لی لیکن حقیقت یہ تھی کہ ''قانونِ عشق'' ابھی تک میں نے بھی نہیں دیکھا تھا۔خیال تھا کہ کہیں نہ کہیں سے تو مل جائے گا۔کشمیری بازار کے قدیم ناشرین جو پنجابی کے پرانے شعرا کے دیوان اور قصے کہانیاں چھاپتے ہیں، وہاں یقیناً یہ کتاب بھی مل جائے گی مگر لاہور جا کر اندازہ ہوا کہ اس کا ملنا مشکل ہے کیونکہ یہ کسی معروف ناشر نے نہیں چھاپی تھی۔بہت تلاش کی مگر ناکامی ہوئی۔ایک دوست نے مشورہ دیا۔

''کسی لائبریری میں مل سکتی ہے۔''

بات ٹھیک تھی مگر لائبریری سے حاصل کیسے کی جا سکتی تھی؟ یہ مسئلہ اپنی جگہ تھا۔اورینٹل کالج کے انتظامی عملے میں میرے ایک دوست تھے ریاض احمد۔میری ان سے دوستی بھی اس طرح ہوئی تھی کہ جب جنوری 1950 کو میں کراچی آنے لگا تھا تو اس وقت میں نے ادیب، عالم اور منشی فاضل کے امتحان پاس کر لیے تھے اس لیے ارادہ یہ تھا کہ کراچی میں کہیں ملازمت بھی کرتا رہوں

گا اور ساتھ ہی ساتھ انگریزی کی مشق بھی کرتا رہوں گا اور ''وایا بٹھنڈا'' میٹرک کا امتحان دے کر تعلیم کا سلسلہ جاری رکھوں گا مگر ہوتا یہ تھا کہ میں ہر سال باقاعدگی سے اپنی فیس اور داخلہ فارم ارسال کرتا تھا لیکن امتحان دینے نہیں جاتا تھا۔ جس دوست ریاض احمد کا میں نے ذکر کیا ہے، وہ اورینٹل کالج کے اکاؤنٹس سیکشن میں کام کرتا تھا، میں اسے لکھ دیتا تھا کہ میں کسی وجہ سے امتحان میں شریک نہیں ہو سکا تھا اور وہ ارسال کردہ فیس میں کچھ منہا کر کے باقی پیسے مجھے کراچی بھجوا دیتا تھا۔ اس موقعے پر بھی وہی میرے کام آیا۔ جب میں نے اپنے مسئلے کا ذکر کیا تو وہ بولا۔

''پہلے مجھے یہ پتا کر لینے دو کہ ہماری لائبریری میں یہ کتاب ہے بھی یا نہیں؟''

اب اِسے میری خوش قسمتی جانیے کہ ان کی لائبریری میں ''قانونِ عشق'' موجود تھی لیکن اسے حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہو؟ میں نہ تو لائبریری کا ممبر تھا اور نہ ہی میرا تعلق کالج کے اسٹاف سے تھا اور لائبریری کی کتابیں ان دونوں حوالوں ہی سے جاری کی جاتی تھیں۔ اس کا حل ریاض نے یہ نکالا کہ پہلے مجھے لائبریری کا ممبر بنوایا۔ مجھے یہ تو یاد نہیں رہا کہ اس وقت ممبر شپ کی فیس کیا تھی۔ خیال ہے معمولی ہوگی، جو میں نے جمع کرا دی ہوگی اور اس طرح ''قانونِ عشق'' میرے نام جاری ہوگئی، اب میرے لیے دوسرا مرحلہ یہ تھا کہ مجھے وہ کتاب واپس کرنے کی بجائے کراچی لانا تھی۔ اس کے لیے راستہ یہ نکالا کہ ممبر شپ کے فارم میں ایک شق یہ تھی کہ اگر کسی سے کتاب گم ہو جائے تو اسے کتاب کی اصل قیمت ادا کرنا ہوگی۔ آپ خود ہی سوچیے اس وقت کتاب کی قیمت کیا ہوگی؟ چنانچہ میں نے اس کی قیمت ریاض کو دے دی اور کتاب لے کر کراچی آ گیا۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ یہ کتاب چھوٹے سائز میں تھی۔ اس دور میں عام طور پر کتابیں 20-30X16 سائز میں چھپا کرتی تھیں لیکن ''قانونِ عشق'' اس سے بھی چھوٹے سائز میں تھی اور کسی نے اس کی جلد شوق سے چمڑے کے بنوائی ہوئی تھی۔ یہ کتاب جب میں نے لا کر ملک صاحب کو پیش کی تو وہ خوشی میں کھڑے ہو گئے اور کتاب کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کے اس طرح بلند کیا جیسے کوئی بہت نایاب چیز مل گئی ہو۔ مجھے تحسین کی نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے۔

''عزیزم۔ تم نے یہ بڑا کام کیا ہے۔ مجھے بہت دنوں سے اس کی تلاش تھی۔''

اس واقعہ سے مجید ملک صاحب کی علم دوستی اور ادب شناسی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ پھر اس سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ اگرچہ وہ پنجابی میں بات چیت نہیں کرتے تھے مگر پنجابی ادب کے دل دادہ ہی نہیں، بلکہ والہ و شیدا تھے۔ ان کے گھر میں ایک بڑی سی شیلف تھی جس کے آگے شیشے لگے ہوئے تھے۔ یہ کتاب انہوں نے اس میں دوسری کتابوں کے ساتھ سجا دی تھی۔ میں جب بھی مجید صاحب سے ملنے جاتا تھا تو اس شیلف پر ضرور نظر مارتا تھا اور اس میں رکھی ہوئی بلکہ اپنی چرائی ہوئی کتاب دیکھ کر مجھے خوشی ہوتی تھی۔ ملک صاحب کے انتقال کے بعد بھی فیض احمد فیض جب کراچی میں آتے تھے تو انہی کے گھر میں قیام کرتے تھے اور میں ہمیشہ ان سے ملنے جاتا تھا، ان سے ملنا تو ہوتا ہی تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ میں شیلف میں رکھی ہوئی ''قانونِ عشق'' ضرور

دیکھتا تھا۔ میرے لیے اس کتاب سے مجید ملک صاحب کی یاد وابستہ ہوگئی تھی۔ میں آخری بار جنوری 1984ء میں آمنہ باجی کے گھر گیا تھا، ان دنوں فیض صاحب وہاں ٹھہرے ہوئے تھے اور میں انہیں اپنے گھر پر کھانے کی ایک دعوت میں مدعو کرنے گیا تھا، اس وقت بھی کتاب اپنی جگہ موجود تھی مگر اس کے بعد کیا ہوا.....؟ یہ مجھے معلوم نہیں کہ وہ اپنی جگہ پر رہی یا نہیں۔ البتہ آمنہ باجی کی زندگی کے آخری ایّام میں ان سے میری ملاقات مشہور مصور احمد سعید ناگی کے ہاں ہوئی تھی۔ وہ ناگی کی سال گرہ کی پارٹی میں آئی تھیں اور اس وقت وہیل چیئر پر تھیں۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے قدرے اداس لہجے میں بتایا تھا۔

''بیٹا! ملک صاحب کا سب کچھ جوں کا توں رکھا ہوا ہے!''

یہاں میں یہ بھی بتا دوں کہ محکمہ اطلاعات کے لیے میں اکیلا ہی مضمون نہیں لکھتا تھا، اور بھی کئی لوگ تھے۔ اردو کے الگ اور انگریزی کے الگ تھے اور بنگلہ زبان میں لکھنے والے علیٰحدہ تھے۔ مختلف موضوعات پر لکھنے والے جدا ہوتے تھے۔ مگر میرا ان سے واسطہ یا تعلق نہیں ہوتا تھا۔ مجھے تو ایک دو یا پھر تین مضمون مہینے میں لکھنا ہوتے تھے جن کے موضوع اکثر مجھے بتا دیے جاتے تھے اور اکّا دُکا میں خود بھی سوچ کر لکھ دیا کرتا تھا۔ 1957ء میں اس وقت کی حکومت پاکستان نے فیصلہ کیا تھا کہ 1857ء کی جنگِ آزادی کی یاد منائی جائے اور سرکاری طور پر پورے ملک میں تقریبات کا انعقاد کیا جائے۔ اس دور میں بنگلہ دیش نہیں بنا تھا اور پاکستان کا وہ حصہ مشرقی پاکستان کہلاتا تھا چنانچہ دونوں حصوں میں پہلی جنگ آزادی کی یاد منانے کی تیاریاں بڑے زور شور سے شروع ہو رہی تھیں۔ انہی دنوں ایک دن مجید ملک صاحب نے مجھے بلایا اور کہا۔

''عزیزم۔ تمہیں معلوم ہوگا کہ حکومت 1857ء کی جنگ آزادی کے سلسلے میں جشن منا رہی ہے اور اس موقعے پر خصوصی پروگرام ترتیب دیے جا رہے ہیں، اخبارات بھی خاص شمارے شائع کریں گے۔''

اتنا کہہ کے وہ چند لمحوں کے لیے رُک گئے اور پھر میز پر اُنگلیاں بجاتے گھماتے ہوئے بولے۔

''تم یوں کرو کہ 1857ء کی جنگ آزادی کے موضوع پر چھ مضامین تحریر کرو!''

میں تھوڑی دیر کے لیے تو جیسے سکتے میں آ گیا کیونکہ اس وقت تاریخ کے اس موضوع پر میرا زیادہ مطالعہ نہیں تھا اس لیے میں نے قدرے جھجکتے ہوئے کہا۔

''ملک صاحب! اس موضوع پر میرا اتنا مطالعہ نہیں ہے۔''

کرسی پر پیچھے کی طرف جھولتے ہوئے کہنے لگے۔ ''میں تمہیں کب کہہ رہا ہوں کہ تحقیقی اور عالمانہ مضمون لکھو۔ بس جیسے سرکاری مضمون ہوتے ہیں۔ اور تم لکھتے بھی ہو، ویسے ہی لکھ دو۔'' پھر جیسے مشورہ دیتے ہوئے بولے۔ ''اس موضوع پر کتابیں مل جائیں گی، چار پانچ کتابیں پڑھ لو، تمہیں پس منظر معلوم ہو جائے گا اور مضمون لکھ لو گے۔''

میں نے پوچھا۔ ''دو چار عنوانات بتا دیجیے۔''

اس پر جواب دیا۔''مضمون تمہیں لکھنے ہیں، عنوانات بھی خود ہی طے کرو۔ بس اتنا خیال رکھنا کہ مرکزِ موضوع 1857ء کی جنگ آزادی ہو اور مسلمانوں کا کردار منفی نہ ہو۔ اس کے علاوہ یہ بھی ذہن میں رکھنا کہ ان چھ مضامین میں جنگ آزادی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ ہو جائے۔''

میں ان سے تو ہامی بھر کے آ گیا تھا مگر مجھے یہ کام مشکل نظر آ رہا تھا۔ سوال لکھنے کا نہیں تھا بلکہ مسئلہ یہ تھا کہ ایک تو اس سلسلے میں میرا مطالعہ محدود تھا اور دوسرا اتنی کتابیں کہاں سے خریدتا اور پیسے کہاں سے لاتا؟ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ایک اُمید افزا خیال آیا۔ اس زمانے میں بندر روڈ پر لائٹ ہاؤس کے پاس فیروز سنز پبلشرز کا شوروم ہوتا تھا جس کا انچارج اور کرتا دھرتا اپنا یار مشہور شاعر سراج الدین ظفر تھا۔ ظفر سے صرف یاری ہی نہیں تھی اکثر شامیں بھی اکٹھی گزارا کرتے تھے۔ میں نے اس سے ذکر کیا تو وہ بھپکا چھوڑتے ہوئے بولا۔''اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ تم دن میں دو چار گھنٹے یہاں آ کر کتابیں دیکھ لیا کرو اور نوٹس وغیرہ لے کر اپنا کام کر لو!'' میں نے ظفر کے ساتھ ''بھپکا چھوڑتے ہوئے'' اس لیے لکھا ہے کہ وہ میرا یار اپنی شامیں تو مے خانے کے ہاؤ ہو میں بسر کرتا تھا لیکن دن میں بھی منہ سے لگی ہوئی اس کافر کو چھونے سے گریز نہیں کیا کرتا تھا۔'' بہرصورت میں نے اس کے بتائے ہوئے نسخے پر عمل کیا۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے مولانا غلام رسول مہر، میاں محمد شفیع، رئیس احمد جعفری اور خواجہ حسن نظامی وغیرہ کی کتابیں پڑھ کے موضوع کے مختلف پہلوؤں سے نوٹس لے لیے جن کی بنا پر بعد میں مضامین تیار کر لیے۔ ملک صاحب نے مجھے چھ مضامین لکھنے کے لیے کہا تھا لیکن میں نے سات مضمون تحریر کیے تھے جن کے عنوانات یہ تھے جو میری ایک نوٹ بک میں اب تک تحریر ہیں۔

(1) پہلی جنگ آزادی
(2) 1857ء کی جنگِ آزادی کا پس منظر
(3) جنگ آزادی میں خواتین کا حصہ
(4) جنگ آزادی میں ادبا و شعرا کا حصہ
(5) پہلی جنگِ آزادی میں علماء کا حصہ
(6) غدر اور غداری
(7) پہلی جنگ آزادی کی ناکامی کے اسباب

جب میں مضامین لکھ کر مجید ملک صاحب کے پاس لے گیا تو انہوں نے سرسری نظر سے ان کا جائزہ لیا اور مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ انہوں نے مضامین پسند کیے تھے، کہنے لگے۔''عزیزم! میرا اندازہ تھا کہ تم یہ مضامین لکھ لو گے اور میرا اندازہ غلط نہیں ہوا۔''

پہلے تو مجھے ایک مضمون کے بیس پچیس روپے ملا کرتے تھے لیکن جنگِ آزادی کے بارے میں لکھے گئے مضامین کا معاوضہ فی مضمون پچاس روپے کے حساب سے ملا تھا۔ اب آپ خود ہی سوچیں کہ جس آدمی کی تنخواہ ساٹھ روپے ماہانہ ہو اور اسے یک مشت ساڑھے تین سو روپے مل جائیں تو اس کی کیفیت کیا ہوگی؟ حقیقت تو یہ تھی کہ جنگِ آزادی کا صحیح جشن تو میں نے منایا تھا۔ یہاں یہ بات بھی بتانے کی ہے کہ میرے لکھے ہوئے یہ ساتوں مضامین اس وقت پاکستان کے تمام اردو اخبارات کے خصوصی شماروں میں شائع ہوئے تھے لیکن ان میں سے کسی ایک پر بھی میرا نام نہیں چھپا تھا۔ جیسے اس سے پہلے والے مضامین نقلی ناموں سے شائع ہوتے تھے اسی طرح ان پر بھی مختلف نقلی نام درج تھے۔ میں نے ان کے تراشے بھی محفوظ نہیں رکھے تھے البتہ اخبارات نے 11 مئی 1957ء کو جنگ آزادی کی یاد میں جو خصوصی شمارے شائع کیے تھے ان میں یہ دیکھے جا سکتے ہیں۔ بعض اخباروں نے ساتوں کے ساتوں مضمون چھاپے تھے، مگر بعض نے پورے شائع نہیں کیے تھے اور اپنی پسند اور گنجائش کے مطابق اپنے خصوصی شماروں میں شامل کیے تھے۔

(جاری ہے)

◆◆◆

ادارہ تخلیق

- رسالہ ''تخلیق'' کا مطالعہ ادبی عبادت ہے۔
- ''تخلیق'' خرید کر پڑھیے۔ سالانہ خریداری قبول کیجئے۔
- سالانہ خریداروں کو ''تخلیق'' ان کے گھر پر پیش ہوگا۔
- سالانہ خریداروں کی تعداد میں اضافہ کریں۔ یہ آپ کا اپنا رسالہ ہے۔

'میری کہانی'

.....3.....

فرخندہ لودھی

ایک بار پھر وہی سٹیشن ہے۔ وہی راستے اور گلیاں.....اور ذاتی مکان۔ گھر کے ماحول میں تناؤ ہے۔

مجھے یہاں آ کر پتا چلا ہے کہ میری ایک بھانجی بھی ہے اور میرا بڑا بھائی منٹگمری میں رہتا ہے۔ بڑی آپا اور بھابھی بہت لڑتی ہیں، بہت لڑتی ہیں۔ کیوں لڑتی ہیں؟ مجھے پتا نہیں چلتا۔ امّاں اور ابّا بھی لڑتے رہتے ہیں۔

ابّا ہر وقت گھر میں پڑے رہتے ہیں۔ کسی کو بلند آواز سے بولنے کی اجازت نہیں۔ جب بھی بچپن کے اس دور کو ذہن میں دوہراتی ہوں، ابّا گھر کے صحن میں پکّے فرش پر بے حال لوٹتے نظر آتے ہیں۔ انہیں کیا تکلیف ہے۔ میں سوچا کرتی تھی۔ امّاں پریشان رہتی ہیں اور بڑی بہنیں صرف کام کاج کے لیے اپنی کوٹھڑی سے باہر نکلتی ہیں۔

ماموں اور ہمارے گھر کے درمیان صرف ایک مکان ہے مگر ماموں کے گھر ہمارا آنا جانا قطعی بند ہے۔ حتیٰ کہ ہم بچے بھی نہیں جا سکتے۔ مجھے کس نے منع کیا، مجھے بالکل یاد نہیں۔ میں گلی کے بچوں کے ساتھ تمام وقت کھیلتی رہتی ہوں یا سامنے ڈاکٹر بسمل کی نوجوان خوبصورت لڑکیوں کے ساتھ دوستی ہے۔ ان کے گھر میں گھسی رہتی ہوں۔ وہ سلائی اور کڑھائی میں لگی رہتی ہیں۔ میری ہم نام منجھلی بیٹی کو بار بار منہ دھو کر سنگار کرنے کا شوق بھی ہے۔ ان کے ہاں امّاں کا آنا جانا ہے اور ان کی ماں بھی ہمارے ہاں آتی جاتی ہیں۔

امّاں گلی کے کسی اور گھر میں نہیں جاتیں اور نہ میرے جانے کو اچھی نگاہ سے دیکھتی ہیں۔ ڈاکٹر بسمل کے گھر جانے سے مجھے کبھی منع نہیں کیا۔ ڈاکٹر صاحب کو شاید میں ماموں کہتی ہوں۔ وہ مجھے سے محبت کے ساتھ پیش آتے ہیں اور میرے ہاتھ ہمارے گھر سے سالن وغیرہ بھی منگا کر کھا لیتے ہیں۔

وہ سرکاری ملازم ہیں۔ کبھی کبھی گھر میں نظر آتے ہیں۔ انہیں کرسی پر بیٹھے کبھی نہیں دیکھا۔ صحن میں بچھی ہوئی کھری چارپائی پر آلتی پالتی مارے بیٹھے نظر آتے ہیں اور سامنے کاغذات بکھرے ہوتے ہیں۔ ان کی بیگم برآمدے میں بڑے ٹھسّے سے

بیٹھی یا تو کوئی کام کر رہی ہوتی ہیں یا حقہ پی رہی ہوتی ہیں۔ بہت موٹی ہیں اور عجب طرح کروٹیں بدل بدل کر باتیں کرتی ہیں۔ ان کی آنکھیں بڑی غصیلی ہیں۔ میں ہمیشہ ان سے خوفزدہ رہتی ہوں۔ ان کو سلام کیا اور آپاؤں کے پاس سرک گئے۔ انھیں کام کرتے دیکھتی رہتی ہوں۔ وہ کیسے خوبصورت گُل بوٹے کاڑھا کرتی ہیں۔ موتیوں کی بائیسیکل کے اوپر سلولائڈ کا گڈا، سر پر فلیٹ لیے سوار۔ جوتوں کے ڈبوں پر چھینٹ مڑھ کر سنگار بکس، آئینہ جڑا ہوا۔ اور گڑیا کے کپڑے۔ وہ ہر وقت لگی رہتی ہیں۔

میں نے ساڑھے تین یا چار سال کی عمر میں ان سے تارکشی کا کام سیکھ لیا تھا۔ اس کے بعد گھر میں کپڑے کا جو ٹکڑا نظر آیا اماں سے مانگ لیا اور تار کھینچ کر تارکشی شروع کر دی۔ مجھے ان دنوں ہر وقت الجھن رہتی تھی کہ مجھ سے پھول کیوں نہیں بنتے۔ کوشش کرتی تو کپڑا اسکڑ جاتا۔ اور اپنے آپ پر نہایت غصہ آتا۔

امّاں مجھے اپنے ساتھ محلے کے ایک اور گھر میں لے گئی ہیں۔ یہاں امّاں کی بچپن کی سہیلی کے والدین رہتے ہیں۔ یہ دِلّی کا نہایت معزز، مہذب اور تعلیم یافتہ گھرانا ہے۔ مجھے ان کے گھر کا ماحول پرسکون اور سلجھا ہوا لگا ہے۔ اس گھر میں ایک سپیدریش بزرگ ہیں۔ جنھیں سب لوگ حافظ جی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ یہی حافظ جی اماں کی سہیلی کے والد ہیں۔ حافظ جی کی بہو بڑی خوبصورت ہے جس کے بہت سارے بچے ہیں۔ ان کی بیگم دھان پان سی، خاموش طبع اور پیار کرنے والی بزرگ ہیں۔ اماں انھیں اماں جی اور حافظ جی کو باوا جی کہہ کر پکارتی ہیں۔

اماں نے مجھے بڑی بی کے سپرد کر دیا ہے۔ میری دینی اور قرآنی تعلیم شروع ہوگئی ہے۔ صبح شام باقاعدگی سے پڑھنے جاتی ہوں۔ اماں کہتی ہیں۔ ''تمہاری آوارہ گردی کم ہوگئی ہے۔''

لوہاروں، ترکھانوں، جلاہوں کی لڑکیاں بھی وہاں پڑھنے آتی ہیں۔ صحن کی ایک دیوار کے ساتھ محرابیں سی چھٹی ہوئی ہیں۔ ان پر سیپارے رکھے لڑکیاں لہک لہک کر سبق یاد کرتی ہیں۔ مجھے ان کے پاس بیٹھنے کی اجازت نہیں۔ بڑی بی پلنگ پر اپنے پاس بٹھاتی ہیں لیکن میرا جی باقی لڑکیوں کے ساتھ آواز ملا کر اور گا گا کر پڑھنے کے لیے تڑپتا ہے۔ مجھے جلدی جلدی سبق پڑھا کر گھر بھیج دیا جاتا ہے۔

کپڑے کے بہت بڑے بیوپاری کی جوان لڑکی قرآنِ پاک ختم کر چکی ہے۔ صرف بڑی بی کو سنانے کے لیے وقت مقررہ پر آتی ہے۔ حافظ جی کی لڑکیوں کے ساتھ اس کی دوستی ہے۔ ان کے ساتھ باتیں کرتی ہے۔ میں نے ان کی چھوٹی پوتی ''پنی'' کو اپنی سہیلی بنالیا ہے۔ پنی کی صورت یاد نہیں رہی۔ اتنا یاد ہے کہ وہ دبلی پتلی، گوری اور نازک سی لڑکی تھی۔ وہ ہر وقت اس زعم میں رہتی کہ وہ بڑے گھر کی بیٹی ہے۔ دوسری لڑکیوں کے قریب وہ خود بھی جانے کی کوشش نہیں کرتی بلکہ بڑے رعب کے ساتھ ان لوگوں کو مخاطب کرتی۔ بات بے بات جھڑکتی جیسے وہ سب سے ارفع ہو۔ اسے باہر جانے کی اجازت نہیں۔ شاید وہ برقع اوڑھتی ہے۔

سب سے بڑی آپا سے چھوٹی کو سب سعیدہ آپا کہتے ہیں۔ مجھے تمام گھر والوں میں سے وہ پسند ہے۔ وہ چپکے سے غریب لڑکیوں کے پاس جا بیٹھتی ہیں۔ باورچی خانے میں بیٹھی ہوئی بڑی بہن اور پلنگ پر براجمان اپنی ماں سے پیٹھ موڑ کر جانے ان لڑکیوں سے کیا باتیں کرتی ہیں اور ان سے چوری چوری املی منگوا کر کھاتی ہیں۔ اماں یا آپا منع کریں تو کھسیانی سی ہو کر اٹھ جاتی ہیں..... پنی نے ان کے املی منگوانے کی شکایت لگائی ہے مگر وہ صاف مکر گئیں.....اور سیدھی پچھلے دالانوں میں گھستی چلی گئیں۔

سعیدہ آپا نے جمعہ کے روز ہم سب بچوں کو بلایا ہے۔ حافظ جی کا کمرہ خالی پڑا ہے۔ پنی نے عید والے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ سعیدہ آپا نے مجھے پاؤڈر لینے کے لیے گھر بھیجا ہے۔

ان دنوں ٹین کے پھولدار ڈبوں میں پاؤڈر ہوتا تھا۔ آپ ڈھکنا کھول کر جتنا چاہیں پاؤڈر نکال سکتے تھے۔ بیچ میں ایک پف بھی ہوتا تھا۔ یہ پاؤڈر کس کوالٹی کا ہوتا تھا مجھے نہیں معلوم۔

کنیز فاطمہ، میری آپا نے پاؤڈر دینے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ میں دل میں شرمندہ اور اداس سی سعیدہ آپا کے پاس گئی ہوں.....مگر پنی کا چہرہ سفید پاؤڈر سے لپا ہوا ہے۔ سعیدہ آپا نے میری بات پر زیادہ توجہ نہیں دی۔

پنی ایک کرسی پر براجمان ہے اور آپا سعیدہ لڑکیوں سے کہہ رہی ہیں:

''دیکھو لڑکیو! ہم سکول سکول کھیل رہے ہیں۔ پنی تمہاری ہیڈ مسٹرس ہیں اور میں تمہیں سبق پڑھاؤں گی''.....اور تمام لڑکیاں اپنی اپنی بیٹھنے کی چوکیوں کی تختیاں بنائے تنکوں کے ساتھ ایک ہی دوات سے روشنائی لگا لگا کر لکھائی کی مشق کر رہی ہیں۔ یہ روشنائی سعیدہ آپا کی ہے.....انہوں نے سب کی تختیوں پر پنسل سے ا۔ ب لکھ دیا ہے۔ لڑکیاں ان ہی حروف پر تنکوں سے روشنائی لگا رہی ہیں۔ میں کیا کر رہی ہوں یاد نہیں۔ پنی چھڑی ہلانے کے سوا کچھ نہیں کرتی۔ باہر موسم گرما کا روشن دن ڈھل رہا ہے۔ کشادہ صحن کے اس پار تمام گھر والے بڑے دالانوں میں پڑے سو رہے ہیں۔

سعیدہ آپا ہمیں شور نہیں مچانے دیتیں.....سکول میں کب چھٹی ہوئی۔ اس کے بعد یہ سکول لگا یا نہیں۔ ذہن میں اس سے متعلق کوئی یاد نہیں۔

حافظ جی کسی دفتر میں اچھے عہدے پر ملازم ہیں۔ کم گو اور نہایت عبادت گزار بزرگ ہیں۔ قریب کی مسجد میں پانچوں وقت کی امامت بھی کرواتے ہیں۔ اس مسجد کے مولوی اور آتے جاتے مسافروں کا کھانا ان کے گھر سے جاتا ہے۔

جب گلیوں میں سے گزرتے ہیں تو بچے اور بڑے انہیں ادب سے سلام کرتے ہیں۔ میں اور میرا چھوٹا بھائی..... چوک میں کھیل رہے ہیں۔ مغرب کی نماز کا وقت ہے۔ حافظ جی سفید براق لباس میں گزرے۔ سب نے سلام کیا۔ چھوٹے بھائی کی عمر اس وقت بمشکل اڑھائی سال ہوگی۔ وہ بھاگتا ہوا گھر گیا اور جوشِ مسرت سے امّاں کو اطلاع دی.....''امّاں میں نے اللہ میاں کو دیکھ لیا.....'' امّاں نے مجھ سے دریافت کیا تو میں نے چھوٹے بھائی سے پوچھا۔ وہ بولا:

''جس کو سب نے سلام کیا وہ اللہ میاں تھا۔''

اب اس عمر میں جب بھی اقبال کے بندۂ مومن کو تصوّر میں لاتی ہوں، حافظ جی (اللہ، جنت نصیب کرے) کی صورت آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔

حافظ جی کا صحن عورتوں سے کھچا کھچ بھرا ہے..... بیچ میں حافظ جی کی میّت پڑی ہے۔ بعض عورتیں فرطِ جذبات سے ان کی پیشانی چوم لیتی ہیں۔ اماں نے بھی ایسا ہی کیا ہے۔ سب کی آنکھیں نم ہیں۔ مگر کوئی بلند آواز سے نہیں روتا۔ حافظ جی کے چہرے پر کتنا نور ہے۔

سعیدہ آپا نے پیر مکوڑے شاہ کی خانقاہ تیار کی ہے اور سب لڑکیوں سے کہا کہ شام کے وقت ان کی گڑیاں سلام کرنے کی غرض سے آ سکتی ہیں۔ میرے پاس کوئی گڑیا نہیں اور مجھے گڑیا سے کھیلنے کا شوق بھی نہیں۔

پیر مکوڑے شاہ کا مقبرہ بہت سجایا گیا ہے۔ ایک اینٹ کے اوپر مٹی کی چھوٹی سی قبر بنا کر سبز کپڑے سے ڈھانپ دی گئی ہے۔ اردگرد سرکنڈوں اور درختوں کی ٹہنیوں سے احاطہ بنایا گیا ہے۔ پھولوں کی پتیوں کے ہار اور خالص مشرقی عطر کے پھوئے جا بجا لٹکے ہیں۔ لوبان اور اگر بتیاں سلگ رہی ہیں۔ قبر پر گیلے آٹے سے بنا ہوا چوکھیا دیا جل رہا ہے۔ ہلکی ہوا کے ساتھ سرکنڈوں سے بور جھڑتا ہے اور خانقاہ میں جا بجا بکھرا پڑا ہے۔ خوشبو میں لپٹی ہوئی ویرانی اور تقدس کا احساس ہوتا ہے۔ گڑیاں تمیز دار بی بی کی طرح قرینے سے درگاہ میں بیٹھی ہیں۔ درگاہ پر چند پیسے بھی چڑھ چکے ہیں۔

مجھے اپنے گھر میں پیر مکوڑے شاہ بنانے کا خیال آ رہا ہے۔ مگر میں اتنی لڑکیاں کیسے اکٹھا کروں گی اور گڑیاں؟

صبح، چھت پر عجیب تمازت بکھیر رہی ہے۔ پڑوس کے باغیچے کے کسی درخت پر بیٹھی کوئی فاختہ دن کے پھیلنے کا اعلان کر رہی ہے۔ اور میرا دل عجیب سا احساس لیے اداس ہو گیا ہے۔ گملوں میں لگے ہوئے گل عباسی کے پودوں پر بے شمار پھول کھلے ہیں۔ یہ پودے مجھ سے بڑے بھائی غیاث احمد نے شوق سے لگائے تھے۔ ان پھولوں کو دیکھ کر خوشی نہیں ہوتی۔

یاد نہیں رہا جولاہے کی لڑکی شریفاں کے ساتھ میری کیسے دوستی ہو گئی۔ اتنا معلوم ہے کہ وہ میری ہم سبق تھی مگر اس کے ساتھ بیٹھنے اٹھنے کی اجازت نہ تھی۔ شریفاں کا باپ کہیں مزدوری کرتا ہے اور وہ اسے دوپہر کی روٹی پہنچانے جا رہی ہے۔ میں بھی ساتھ چل رہی ہوں۔

بہت بڑی عمارت تعمیر ہو رہی ہے۔ دوپہر کا نہ جانے کونسا وقت ہے۔ شریفاں کے باپ نے کھانے کی پوٹلی کھولی۔ دو بڑی بڑی روٹیاں جن کے اوپر پسی ہوئی لال مرچیں رکھی ہیں۔ وہ مزے مزے سے روٹی کھا رہا ہے۔ مجھے بھوک لگ آئی ہے۔ نہ معلوم کیوں؟

حافظ جی کی گلی میں کسی نے بچوں میں نیاز تقسیم کی ہے۔ ابا جی باہر کھڑے ہیں۔ ہمیں نیاز لینے کی اجازت نہیں۔ جب

تک نیاز بٹ نہیں گئی وہ ادھر ادھر گھومتے رہے۔ دریچے کے پیچھے کھڑی عورت نے اشارے سے مجھے بلایا ہے کہ میں نیاز کی چیز لے لوں۔ میں دور کھڑی کھڑی دھیرے سے بڑبڑائی ہوں۔

''نہیں.....ہم نہیں لیں گے.....''

میرا سرانکار میں ہلتا رہا اور ابا کی آنکھوں کا خیال خوف کی طرح چپکا ہے۔

گھر میں اکثر چولھا ٹھنڈا رہتا ہے۔ ابا لڑتے ہیں۔ پھر اماں اور ابا میں اپنے آپ کوئی سمجھوتا ہو جاتا ہے۔ ابا بازار سے لدے پھندے واپس آتے ہیں۔ گھر میں رونق کی لہر دوڑ جاتی ہے۔

حافظ جی کے یہاں لڑکیاں شریفاں کے بارے میں چہ میگوئیاں کرتی ہیں اور اس سے دور رہنے کی کوشش کرتی ہیں۔ پتا چلا کہ وہ کوڑے پر سے گلے سڑے پھل اٹھا کر کھا لیتی ہے۔ گویا یہ بہت ہی خراب بات ہے۔ میں سوچتی ہوں۔

میں صبح کو سبق سنا کر باہر نکلی ہوں۔ شریفاں کوڑے میں سے کیلے کے چھلکے اٹھا کر کھا رہی ہے۔ میں شریفاں سے ناراض ہوتی ہوں۔ مجھے رنج ہوا ہے۔ مگر اس کی یہ حرکت بھولتی نہیں.....اس وقت وہ زندہ ہے یا نہیں؟ لیکن مجھے یاد آ رہی ہے۔

.....(جاری).....

◆◆◆

دل کو دُکھ درد سے آباد کیا ہے میں نے
جب بھی اے دوست تجھے یاد کیا ہے میں نے
جب بھی ہچکی تجھے بے ساختہ آ جائے کبھی
سوچ لینا کہ تجھے یاد کیا ہے مَیں نے

(اظہر جاوید)

نکلے ہوئے جنت سے

.....7.....

عزیز میرٹھی

حضرت خواجہ سے ملاقات بڑی روح پرور تھی۔ میری گزارش پر انہوں نے میری کتاب ''راگ رنگ'' کا دیباچہ جو ایک صفحے پر مشتمل تھا، لکھ کر مجھے عنایت کر دیا۔ میں شاداں و فرحاں.....اسی روز دہلی سے بمبئی روانہ ہو گیا۔ ایک دن آرام کیا اور دوسرے روز میں نفیس خلیلی صاحب سے ملنے گیا۔ ان کے فلیٹ پر تالا پڑا تھا۔ رنجیت سٹڈیو پہنچا تو پتہ چلا، وہ ایک ہفتہ قبل اپنی سسرال ملتان جا چکے ہیں۔ گیٹ سے اندر آتے ہوئے ڈائریکٹر چتر بھج دوشی کو دیکھ کر منہ چھپایا کہ کام ادھورا چھوڑ کر ایسا غائب ہوا جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ لوکل ٹرین میں سوار ہو کر ماہم پہنچا کہ تنویر نقوی کو اپنی آمد سے مطلع کروں لیکن وہ بھی گھر پر نہ ملے۔ واپسی میں فلورا فاؤنٹین آ کر اُترا۔ یہ بمبئی کا نہایت خوبصورت پوش علاقہ ہے۔ فوارے کے پاس کھڑے ہو کر اپنے چاروں طرف طائرانہ نظر دوڑائی جائے تو راہ گیروں کے ہجوم سے قطع نظر، ہندوستان کا نہیں، کسی یورپین شہر کا چوک معلوم ہوتا ہے۔ اس علاقے میں دو ایسے خوش نما سنیما ہاؤس ہیں جن کی لابی سے شو ٹائم پر ایک مخصوص اور مُسحور کن مہک سڑک تک آ کر، تماشائی کو کچھ اس طرح اپنی جانب کھینچتی ہے جیسے لوہے کو مقناطیس اور دونوں سنیماؤں کی خوشبو میں اتنی ندرت ہے کہ اگر آپ کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر پوچھا جائے تو آپ بلا توقف کہہ اٹھیں گے کہ یہ پلازہ ہے اور وہ میٹرو تھا۔ الغرض بے مقصد و بے ارادہ یونہی ادھر اُدھر گھومتا رہا۔ اگرچہ مصّوری ترک کئے ہوئے اک زمانہ ہوا۔ تاہم اس فن سے جو فطری لگاؤ تھا اس کے تحت جہاں بھی جاؤں عجائب گھروں اور آرٹ گیلریوں میں بصد شوق آج تک جانا نہیں چھوٹا کہ یہ بھی ایک نشہ ہے۔

غالبؔ چھٹی شراب پر اب بھی کبھی کبھی　　پیتا ہوں روز ابر و شبِ مہتاب میں

بس یونہی منہ اٹھائے چلا جا رہا تھا کہ بمبئی کا ایک عجائب گھر سامنے آ گیا۔ ٹکٹ خریدا اور اشیائے عجائب و غرائب، آثار رفتگاں، نادر و نایاب فن پارے اور کمالات ہنروراں سے محظوظ ہونے کے لئے اندر داخل ہوا۔ یہاں دیکھنے کو اتنا کچھ تھا جس کے دیکھنے کو عمر عزیز کا ایک حصہ درکار ہے۔ لیکن میری دلچسپی صرف تین گیلریوں تک محدود تھی۔ ان میں ایک گیلری سمندری مخلوق خصوصاً مچھلیوں

کے متعلق تھی جس میں ہزار ہا قسم کی مچھلیاں جمع کی گئی تھیں۔ چیونٹی کے برابر مچھلی سے لے کر گز وں لمبی مچھلیاں تھیں، یہاں تک کہ جگہ نہ ہونے کے باعث گیلری میں اس سرے سے اُس سرے تک مصالحوں کے ذریعے محفوظ کی ہوئی ایک شارک، زنجیروں میں باندھ کر گیلری کی چھت سے لٹکائی گئی تھی۔ ان کے رنگوں، شکل وشباہت اور ڈیزائن میں بلا کا تنوّع تھا۔ کئی مچھلیاں خالص چاندی اور کئی سونے میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ کئی مچھلیاں جگنوؤں کی مانند روشنی ساتھ لئے پھرتی تھیں۔ چھوٹی مچھلیوں اور ہر سائز کی مچھلیوں کے مطابق شیشے کے چھوٹے اور بڑے کیسوں میں رکھا گیا تھا جن میں صاف پانی اور ہوا پہنچانے کے علاوہ مخصوص قسم کی سمندری گھاس پھونس، ریشے، پتھر، ریت، گھونگے اور مصنوعی چٹانیں بنائی گئی تھیں۔ تاکہ اس قید میں بھی انہیں اپنا فطری ماحول میسر آ سکے۔

دوسری گیلری تتلیوں کی تھی۔ اس میں بھی لکھوکھا، رنگ برنگی تتلیاں، مکھی سے لے کر بڑے دستی پنکھے کے سائز تک کی تتلیاں موجود تھیں۔ قدرتِ کاملہ کی صنّاعی کے بے مثال شاہکار یہ حسین وجمیل اور جاذب نظر تتلیاں اتنے مختلف رنگوں اور نو بہ نو ڈیزائنوں میں تھیں کہ دنیا بھر کے کپڑا بنانے والے مل مالکان اگر ان سے استفادہ کریں تو انہیں کسی ڈیزائنر کی ضرورت باقی نہ رہے اور کیا عجب کہ مل مالکوں سے گراں قدر معاوضہ وصول کرنے والے یہ ڈیزائنر اپنے ڈیزائنوں کے لئے ان ہی آبی اور ہوائی مخلوقات کے مرہونِ منت ہوں کیوں کہ انسان کتنا بھی بلند تخیّل کیوں نہ ہو خالقِ کائنات کے مقام ومرتبے تک ہرگز نہیں پہنچ سکتا، جب کہ بندے کی سوچ اور اپروچ محدود ہے اور بندہ پرور کی لامحدود۔

تیسری اور سب سے اہم گیلری پتھر سے تراشے اور مختلف دھاتوں سے ڈھالے ہوئے مجسموں پر مشتمل تھی۔ اہم اس لئے بھی کہ پہلی دونوں گیلریوں میں خالقِ کائنات کے تخلیق کردہ شاہکار اور دستِ قدرت کے نمونے تھے، جب کہ اس تیسری گیلری میں انسانی دست کاری اور تخلیقی صلاحیت کے مرقّعے سجائے گئے تھے۔ فنِ مجسمہ سازی میرے نزدیک مصوری سے زیادہ مشکل اور افضل ترین فن ہے کیونکہ تصویر میں اگر مصور سے کوئی ایک لکیر یا خط غلط لگ جائے تو اسے ربڑ سے مٹا کر درست کیا جا سکتا ہے۔ اگر تصویر رنگین ہو تو کسی غلط رنگ کو تحلیل کر کے صحیح رنگ لگایا جا سکتا ہے۔ ہلکے رنگ کو گہرا اور گہرے رنگ کو ہلکا کیا جا سکتا، رنگ کی کسی بھی غلطی کو چھپانے مٹانے کے لئے اس کے پاس سفید رنگ موجود ہوتا ہے۔ لیکن مجسمہ ساز کو کاغذ یا کینوس کی بجائے پتھر کے ایک سالم ٹکڑے کو تراش کر اپنے خیالی پیکر کو جو اس کی سطحِ ذہن پر نقش ہوتا ہے یا جاندار اور بے جان ماڈل کا روپ دینا ہوتا ہے۔ پین اور سیاہی یا رنگ اور مُوئے قلم کی جگہ چھینی اور ہتھوڑا استعمال کرنے پڑتے ہیں۔ ایک معمولی لغزش، ایک خفیف سی غلط ضرب اس کی مہینوں کی محنت اور عرق ریزی کو مٹی میں ملا سکتی ہے۔ ذرا سی بے احتیاطی سے مجسّمے کی آنکھ پھوٹ سکتی ہے، ناک ٹوٹ سکتی ہے، کان کٹ سکتا ہے اور یوں پورے کا پورا مکمل مجسمہ پتھر کا بیکار ٹکڑا بن کر رہ جائے گا۔ کیوں کہ کٹے اور ٹوٹے ہوئے اعضا نہ جوڑے جا سکتے ہیں نہ کسی اور تدبیر سے اس غلطی کا ازالہ کیا جا سکتا ہے۔ بجز اس کے کہ پتھر کا نیا ٹکڑا لے کر نئے سرے سے قطرہ قطرہ خون جگر

پلایا جائے۔

دوسری مشکل یہ ہے کہ پنسل یا موئے قلم کے ذریعے تصویر کے جملہ نقوش، چہرے اور ہاتھوں کی جُھریاں بالوں کے پیچ و خم، تراش خراش، کھال اور لباس کی نرمی ملائمت باریکی یا دبازت اور سلوٹوں یا شکنوں کو لائٹ اینڈ شیڈ کے ذریعے اجاگر کرنا کہیں زیادہ آسان ہے بہ نسبت ہتھوڑے اور چھینی کے اور پھر سنگی مجسموں کے برعکس دھات کے مجسموں میں ایسی تمام صفات و کیفیات کو واضح کرنا تو اور بھی مشکل اور عمل در عمل کے عذاب سے گزرنے کے مترادف ہے۔ اس گیلری میں مجسمہ سازی کے کئی قابل ذکر مجسمے موجود ہیں، مثلاً ایسے مجسمے بھی دیکھے جو بے نور آنکھوں کے ساتھ زندہ ہیں اور ایسے بھی جو مردہ ہیں اگرچہ ان کی آنکھیں کھلی مگر بنوائی ہوئی ہیں مثلاً ایسے لوگ بھی جن کی آنکھوں میں زندگی کی تابندگی ہے اور ایسے بھی جن کی آنکھیں بے نور ہیں۔ وہ آنکھیں بھی جن میں محبت، نفرت، خوشی، غم، رحم اور غصے کے اثرات نمایاں طور پر دیکھے جاسکتے ہیں۔ لاٹھی کا سہارا لئے ایک اندھا فقیر اور اس کے ساتھ چیتھڑوں میں لپٹی ایک کمسن خوبصورت لڑکی، تھنوں کو چوستا ایک نوزائیدہ بچھڑا۔ اور گردن موڑے اس کی کمر کو چاٹتی ہوئی گائے، جس کی آنکھوں سے مامتا ٹپکی پڑتی ہے۔ بلکہ ایک قدم اور آگے مجسمہ ساز کی نزاکت فن کا منہ بولتا ثبوت، بچھڑے کی کمر کا وہ حصہ، جسے چاٹنے کے باعث وہاں کا نرم رواں چمکتا ہوا نظر آتا ہے، عرصہ کارزار میں، گھوڑے پر سوار ننگی تلوار سونتے ہوئے سورما، اور اپنی ڈھال کو سپر بنائے دشمن گھوڑے سے گرتے ہوئے، گھوڑے کا کف آلود دہن اور وحشت ناک آنکھیں، یہ اور اس کے علاوہ اور بہت کچھ اور یہ سب محض پتھر کی ایک چٹان، ہتھوڑا، چھینی اور مجسمہ ساز کے فنی شعور کا کرشمہ۔

یوں ہی ورطۂ حیرت میں گم، چلتے چلتے ایک جگہ میں نے ایک ایسا مجسمہ بھی دیکھا، جس کی دوسری مثال ناممکن ہے۔ مجسمہ سازی کی تاریخ میں بھی نہ مل سکے۔ اس مجسمے نے میرا دامن تھام کر قدم آگے بڑھانے سے روک دیا اور مجسمے کے خالق نے غائبانہ مجھے کچھ دیر، رک کر غور و فکر کرنے کی دعوت دی۔ اس نے میرے کان میں سرگوشی کی کہ ''اے فنِ مصوری'' کے شیدائی اور مجسمہ سازی کے جاں دادہ، میری اس کاوشِ فن کو سرسری دیکھ کر نہ جا۔ نگاہِ دور بیں ڈال کر، بصارت پر بصیرت کا چشمہ لگا کر اس کمال حسن یا حسنِ کمال کی داد تو دیتا جا۔ جو میں نے اپنے اس شاہ کار میں پیدا کرنے کے لیے مدتوں خون جگر صرف کیا کیونکہ معجزۂ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود۔'' یہ ایک سال بھر کے بچے کا لائف سائز مجسمہ تھا۔ تانبے اور کانسی کی دھاتوں میں ڈھلا گلیکسو بے بی کی طرح گول مٹول، تندرست و توانا بچہ قالین پر بیٹھا ایک گیند سے کھیل رہا ہے۔ پہلی نظر میں یہ ایک معمولی مجسمہ نظر آیا۔ جس میں سوائے اس کے اور کوئی بات قابلِ ذکر نہ تھی کہ اس کی نیم وا آنکھوں میں معصوم نورانی جھلک تھی۔ سر پر ریشم جیسے باریک گھونگریالے بال تھے اور ترشے ہوئے ادھ کھلے ہونٹوں سے رال کا ایک قطرہ گویا ٹپک پڑنے کو تھا۔ قدرے ناگواری سے چہرہ ایک طرف کو موڑے ہوئے تھا۔ قدرے توقف کے بعد میں نے سوچا کہ اگر یہ ایسا ہی معمولی مجسمہ ہوتا جیسا کہ بظاہر نظر آتا ہے تو عجائب گھر کی زینت بننے کی بجائے کسی کباڑیئے کے پاس برائے فروخت پڑا ہوتا۔ اس میں ضرور کوئی ایسی غیر معمولی خوبی پوشیدہ ہے جس کی تلاش و جستجو

پر اس کا خالق ہمیں مجبور کر رہا ہے۔ اس شے کو اس نکتہ پنہاں کو ڈھونڈ نکالنا ہی اس کے فن کی داد کا حق ادا کرنا ہے۔ یہ داد ا سے نہ ملی تو وہ ناظرین کی کور چشمی اور بد ذوقی کو کوسے گا یا اپنی کم نصیبی پر آنسو بہائے گا۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وہ نظر کیا

ایک بڑے نقّاد سے کسی نے سوال کیا ''شاہکار کی تعریف کیا ہے؟'' دانشور نقّاد نے جواب دیا:

''شاہکار وہ فن پارہ ہے جسے تخلیق کرنے میں فنکار مسلسل درد و کرب میں مبتلا ہو، اپنی تمام تر تخلیقی صلاحیتوں، ذہنی، جسمانی اور روحانی قوّتوں کو بڑے خلوص سے بروئے کار لایا ہو لیکن دیکھنے والے کو ایسا معلوم ہو جیسے کوئی محنت یا کاوش نہیں کی گئی۔ بس یونہی ''کُن'' کہنے سے وجود میں آ گیا۔ شاعری کی اصطلاح میں اسے ''سہلِ ممتنع'' کہتے ہیں۔''

نازکی اس کے لب کی کیا کہیے پنکھڑی اک گلاب کی سی ہے
میؔر ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے

.....

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

میں نے مجسمے کو پوری دلچسپی اور توجہ سے دیکھنا شروع کیا۔ بچہ دونوں ہاتھوں سے گیند کو دبائے ہوئے ہے۔ گیند ربڑ کا ہے، اس بچے کی اُنگلیوں کی پوریں گیند میں گُھسی ہوئی ہیں۔ گیند میں کوئی مہین سا سوراخ بھی ہے لہٰذا بچے نے جب گیند کو دبوچا اور گیند پر دباؤ پڑا تو گیند کے سوراخ سے ہوا نکل کر بچے کے چہرے پر پڑی، جس سے اسے جھرجھری سی آ گئی۔ بس اس تاثر، اس نازک لمحاتی کیفیت کو، مجسمہ ساز نے اپنی گرفت میں لے لیا۔ جب میں دیر تک کبھی بچے کے چہرے کو اور کبھی گیند کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا تو یقین کیجیے میری نگاہوں نے، ڈاکٹر کی سرنج سے نکلی ہوئی دوا کی دھار کی مانند ہوا کی ایک غیر مرئی لکیر گیند سے نکل کر بچے کے چہرے پر پڑتی ہوئی دیکھی۔ شعراء حضرات تو صفحۂ قرطاس پر قلم سے ایسے شعبدے دکھایا ہی کرتے ہیں کہ نظر نہ آنے والی شے دکھائی دے اور دکھائی دینے والی چیز نظر نہ آئے، جیسے:

جان جاتی دکھائی دیتی ہے
ان کا آنا نظر نہیں آتا

ثابت ہوا ادیب، شاعر، موسیقار، مصور اور مجسمہ ساز، سب ایک ہی کشتی کے سوار۔ ایک ہی منزل کے راہی اور ایک ہی قبیلے کے افراد ہیں۔

یورپ اور امریکہ کے متعدد شہروں میں، مائیکل انجیلو اور دوسرے نامور مجسمہ سازوں کے بنائے ہوئے سنگی اور دھاتی

شاہکار مجسمے ،ازمنہ قدیم کی یادگاروں کے طور پر لاکھوں کی تعداد میں، شاہی محلات، گرجوں اور تاریخی عمارتوں کے علاوہ چوراہوں اور عام شاہراہوں پر ایستادہ نظر آتے ہیں۔ ہمارے پاکستان میں بھی ٹیکسلا اور گردونواح میں خصوصاً مہاتما بدھ کے لاتعداد چھوٹے بڑے مجسمے موجود ہیں علاوہ ازیں لاہور شہر میں بھی مال روڈ پر پنجاب یونیورسٹی کے باہر برلب سڑک، سنسکرت کے پروفیسر الفریڈ ولنر (1878-1936) کا دھاتی لائف سائز مجسمہ اور صوبائی اسمبلی کے سامنے باغیچے میں شاہی تخت پر متمکن برطانیہ کی ملکہ وکٹوریہ کا لائف سائز کانسی کا مجسمہ موجود تھا۔ جسے 1974ء میں ''اسلامی سمٹ کانفرنس'' کے موقع پر مسلمان سربراہان مملکت، شاہ فیصل، احمد سوئیکارنو، معمر قذافی وغیرہ کی آمد کے موقعے پر اس وقت کے وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے مصلحتاً وہاں سے اٹھوا کر عجائب گھر میں منتقل کرادیا اور اس کی جگہ سنگ مرمر کے خوبصورت گنبد کے نیچے ایک چبوترے پر دھات کی بہت بڑی رحل اور اس پر دھات ہی میں ڈھلا قرآن مجید کا کھلا نسخہ رکھوا دیا۔ سنگ مرمر سے تراشا ہوا سر گنگا رام کا خوبصورت مجسمہ لاہور میوزیم کے باہر سڑک پر بیٹھے ہوئے انداز میں موجود تھا۔ اس مجسمے کو نابغۂ روزگار، افسانہ نگار سعادت حسن منٹو نے اپنی کتاب ''سیاہ حاشیے'' میں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے تاریخی ورثہ بنا دیا۔ لکھتے ہیں:

> ''تقسیم ہند کے وقت ہندو مسلم فسادات کی آڑ میں کالج کے چند جذباتی طلباء نے اس فرشتہ صفت عظیم ہستی کے سفید براق مجسمے پر پتھراؤ کیا اور اس کی نورانی پیشانی پر غلیظ کیچڑ مل کر داغدار کرنے کی مذموم کوشش میں مصروف تھے کہ عین وقت پر پولیس نے پہنچ کر لڑکوں پر اندھا دھند لاٹھی چارج کر دیا۔ کچھ بھاگ گئے کچھ زخمی ہو گئے، زخمیوں کو علاج کے لئے فوری طور پر گنگا رام ہسپتال پہنچا دیا گیا۔ آج بھی اس نیک نام ہستی کا فیض عام ہسپتال کی صورت میں جاری ہے۔''

یادوں کی ڈور تھامے ہم بمبئی کے عجائب گھر سے لاہور آ گئے تھے۔ کیوں کہ ذکر مجسموں کا جاری تھا۔ چلو دو چار پل کے لئے پھر اسی عجائب گھر میں چلتے ہیں۔ گیلری میں سیاحوں کے آرام کی خاطر، بڑے بڑے گول ستونوں کے اردگرد ریکیسن کے نرم کشن بنائے گئے تھے، تاکہ لوگ تھک جائیں تو ان پر بیٹھ کر دو گھڑی آرام کر لیں، میری آنکھیں اور پاؤں بھی تھک کر چور ہو چکے تھے۔ سو وہاں بیٹھ کر اس گیند والے بچے کے بے مثال مجسمے کے سحر میں گرفتار اس کے خالق کو خراج تحسین پیش کرنے لگا۔ جو خدا جانے کس ملک کی سرزمین میں منوں مٹی تلے آسودۂ خاک ہے۔ وہیں بیٹھے بیٹھے شام نے آ لیا۔ میوزیم کی اونچی محرابی کھڑکیوں کے شیشوں سے اندر آتی شفق کی لالی نے مجسّموں کو مزید نظر افروز رنگ دے دیا۔ اس سے پہلے کہ رات کا اندھیرا مجھے آ گھیرے، میں مسافر خانے کی طرف روانہ ہو گیا۔

(جاری ہے)

◆◆◆

سفرِ شمال

.....4.....

طارق محمود

بحرین سے کالام کا سفر یوں تو محض پینتیس چالیس کلومیٹر پر محیط ہوگا لیکن ایک ابتلا سے کم نہ تھا۔ والیٔ سوات کے زمانے کی تعمیر کردہ شاہرات ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوگئی تھیں۔ محکمہ فنڈ کی عدم دستیابی کی شکایت کرتا، فنڈ مل بھی جاتے تو اونٹ کے منہ میں زیرے کے مترادف ہوتے۔ بحرین کالام شاہراہ تو مکمل بحالی اور توسیع کا تقاضا کر رہی تھی۔ اُدھر سیر وتفریح کے رسیا شائقین اس ٹوٹی پھوٹی شکستہ سڑک کی پرواہ کیے بغیر اپنی خو میں تھے۔ گرمی نے زور پکڑا تو ہجوم نے کشاں کشاں ان خوبصورت سبزہ زاروں اور وادیوں کا رُخ کر لیا۔ ہماری گاڑی دھیمی رفتار سے رواں تھی، مسلسل ہچکولوں سے سڑک کے دائیں بائیں دور تک پھیلا حسین منظر اتھل پتھل ہونے لگتا۔ میں نے سڑک کے ساتھ ساتھ دریائی کھائی کی طرف دیکھا۔ ایک نظر پہاڑ کی طرف اٹھائی۔ قریب ہی ایک معلّق پل Suspension Bridge تھا جس پر لوگ آ جا رہے تھے۔ محمد شاہ نے گاڑی کو بریک لگائی میں گاڑی سے اُترا اور معلق پُل کی طرف چل پڑا۔ کچھ ہی دیر میں، مَیں نے پُل کو عبور کیا اور پہاڑی راستے پر ہولیا۔ تنگ پگڈنڈی پر پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ اس وقت سانس بھی پھول چکا تھا۔ قریب میں بستی دکھائی دے رہی تھی۔ صحت کا دیہی مرکز تھا جہاں جواں سال فیملی ورکر بڑی مستعدی سے خواتین اور بچوں کو ملاحظہ کر رہی تھی۔ کیا نام ہے! وہ قدرے چونکی اور پھر اس نے اپنے نام سے آگاہ کیا۔ باغ و بہار کھلی رُت کی نسبت سے مجھے معصوم چترالی لڑکی یاد آ گئی جس نے میرے استفسار پر اپنا نام جہاں پرواز بتایا تھا۔ یہاں کے ناموں میں بھی کتنی غنائیت تھی۔ میں لمحہ بھر کے لیے سوچ میں تھا۔

موسم سرما کی آمد تھی، گرمی کی شدّت سے ستائے ہوئے لوگ فیصل آباد، گوجرانوالہ، ملتان، حیدرآباد اور کراچی سے لمبی مسافت طے کر کے جوق در جوق یہاں چلے آتے۔ دریائے کالام کے گردونواح میں ہوٹلوں، بسر گاہوں، کیمپوں میں ڈیرے ڈال لیتے۔ شام ہوتے ہی ہر طرف چہکار ہو جاتی۔ تنگ راستوں پر لوگوں کا ہجوم اُمڈ آتا۔ بچے، بوڑھے، جوان اپنی اپنی شلواریں اُڑس کر کسی بلند چٹان پر بیٹھ جاتے۔ اپنے ننگے پاؤں شوریدہ لہروں کے سپرد کر دیتے۔ اُن کے چہروں کے تاثرات سے پانی کی کاٹ اور ٹھار کا بخوبی اندازہ ہو رہا تھا۔ کالام کی مصروف گزرگاہ پر ہر طرف رونق ہی رونق تھی۔ ہوٹلوں میں تِل

دھرنے کی جگہ نہ تھی، ریسٹ ہاؤسوں میں خلقت سمائی تھی۔ بازار سے گزرے تو باربی کیو کی خوشبو اور فضا میں پھیلا ہلکا دھواں بھوک تیز کر دیتا، جیسے ہی موسم کی بساط سمٹی، کالام کو خنکی اور پالے نے آن لیا۔ لوگ میدانی علاقوں کی طرف چل دیئے۔ سردیوں کی آمد آمد ٹھہری۔ بھیڑ بکریاں، ریوڑوں میں نشیبی علاقوں کی طرف سفر میں تھیں۔ اُن کے مالکان کو اب یہاں سے نکلنے کی جلدی تھی۔ جانوروں کی بھیڑ سے کہیں ٹریفک کی روانی متاثر ہوئی تو چرواہے نے تڑتڑ کی رَٹ لگا کر ہوا میں لٹھ لہرا دیا، ریوڑ کو سڑک کے ایک طرف کیا اور سست رو گاڑیوں کو گزرنے کا راستہ دے دیا۔

سردی کی کاٹ فضا میں پھیل رہی تھی۔ برف باری کا آغاز ہو چکا تھا۔ مقامی سول ہسپتال سے میرا گزر ہوا۔ ہُو کا عالم تھا۔ شاذ ہی کہیں کوئی مریض دیکھ پائے۔ عملہ بہرطور موجود تھا۔ سینئر میڈیکل آفیسر ڈاکٹر اقبال، دہکتے کوئلوں کا سٹوو جلا کر آگ سینک رہا تھا۔ سٹوو کے اردگرد سردی سے بے حال کچھ اور لوگ بھی اپنی ہتھیلیاں سینک رہے تھے۔

کالام سے لوٹا تو رات بھر کے لیے بدین میں قیام تھا۔ دریا کے ڈھائے پر واقعہ فاریسٹ ریسٹ ہاؤس کی بنیادیں بھی دریائی لہروں میں ڈوبی تھیں۔ کھلی کھڑکی سے ٹھاٹھیں مارتی پرجوش لہروں کا منظر اور دریا پار سرسبز پہاڑی سلسلے تھے۔ رات بھر دریا کی شوریدہ لہروں کا شور اور کھڑکی سے خنک ہوا کی وارفتگی میری نیند سے اٹھکیلیاں کرتی رہیں۔

نیلگوں آسمان پر سورج بڑی تابانی سے اپنی جگہ بنا رہا تھا۔ سنہری کرنیں نامحسوس انداز سے دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ میں نے فوکر طیارے کی کھڑکی سے جیسے ہی جھانکا تو وہاں وادیوں کے اردگرد پہاڑوں کے تھکے سایے رینگتے دکھائی دیئے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ڈھلتی شام نے سرسبز کھیتوں، جابجا چھوٹے چھوٹے گھروندوں کو اپنی بانہوں میں لپیٹ رکھا ہے۔ ابھی دِن چڑھے اتنا وقت بھی نہ ہوا تھا۔ بلند پہاڑوں کے گہرے سایے میں بسنے والی وادیاں، دھوپ کی چند کرنوں کی منتظر رہتیں۔ سورج نے کہیں سے اپنا رُخ دکھایا تو وادی روشنی میں نہا گئی، رُخ بدلا تو پہاڑوں کا قد کاٹھ اور اُن کے سایے وادی پر حاوی ہوتے گئے۔ ایئر ہوسٹس کے بیان کے مطابق ہم اس وقت لووارئی ٹاپ سے گزرتے ہوئے وادیِ چترال میں داخل ہو چکے تھے۔ فوکر طیارہ اس وقت زمین پر اُترنے کی تیاری میں تھا۔ زمین پر ہرے بھرے چوکور کھیت دکھائی دے رہے تھے۔ پہاڑی دریائی سلسلے جابجا پھیلے تھے۔ دریائے چترال اپنے جلو میں کئی وادیوں کے نالوں اور چشموں کا پانی سمیٹے وادی کے وسط میں رواں تھا۔ دور تک مخروطی چھتوں سے مزین گھروں کا سلسلہ پھیلا تھا۔ سُرخ، سبز اور چاندی رنگ کی ٹین کی چھتیں بڑی بھلی لگ رہی تھیں۔ سڑک پر ہر قسم کی ٹریفک رینگ رہی تھی۔ ان میں تیز رفتار گاڑیاں بھی تھیں۔ مال بردار ٹرکوں، سوزوکی ویگنوں، جیپ اور کوسٹرز کا تانتا بندھا تھا۔ برف باری کی شدت سے زمینی راستے مہینوں بند پڑے رہتے۔ یہاں کے رہنے والے حسبِ ضرورت اِن ایام کے دوران وافر مقدار میں گندم اور اناج کا ذخیرہ کر لیتے۔ ملک کے زیریں علاقوں سے تمام راہیں مسدود تھیں۔ ایئر ہوسٹس کی حتمی اناؤنسمنٹ کے کچھ ہی دیر میں طیارہ چترال ایئرپورٹ پر لینڈ کر چکا تھا۔ پشاور سے روانہ ہوئے تو جہاز کی نصف کے لگ بھگ

نشستیں خالی تھیں۔ ہمارے ہم سفر چند غیر ملکی سیّاح بھی تھے۔ ابھی نائن الیون کا سانحہ نہ ہوا تھا اور نہ ہی کسی تورا بورہ کو نیست و نابود کیا گیا تھا۔ افغانستان میں طالبان کی حکومت تھی۔ امن وامان کی صورتحال مخدوش نہ تھی جس سے آج سارا خطّہ دوچار ہے۔

میں نے بلندی پر واقع ریسٹ ہاؤس کے لان سے ریلنگ تھام کر ایک نظر سامنے دیکھا۔ دریائے چترال کی لہریں اپنی جولانی میں تھیں، دریا کے ایک کنارے، کنکریٹ کے پشتے سے شدومد سے ٹکرا رہی تھیں۔ فضا میں چارسُو، ان لہروں کا شور گونج رہا تھا۔ رات گئے ہر طرف خاموشی تھی لیکن دریائی لہروں کی چیخ چنگھاڑ کا ناختم ہونے والا سلسلہ جاری تھا۔ پہاڑی اور میدانی علاقوں میں بہنے والے دریاؤں میں شاید یہی فرق تھا۔ برسوں پہلے شام کے سمے میں پنج ند کے مقام پر کھڑا تھا۔ دریاؤں کا سنگم تھا۔ لہریں بڑی شانت سے بہہ رہی تھیں۔ ان دریاؤں میں راوی بھی تھا جو چناب میں سمو چکا تھا۔ ستلج بھی مدغم تھا۔ پھر کچھ سفر طے ہوا تو مٹھن کوٹ تھا جہاں سندھو بھی آن ڈھلا۔ دریائی سلسلہ میلوں تک پھیل گیا۔ سطح پر سکوت تھا۔ زیرِ سطح تلاطم ممکن تھا۔ طغیانی بھی ہوسکتی تھی۔ یہی دریائی سلسلہ رُت بدلتے سردیوں کی آمد آمد پر سکڑ جاتا۔ پانی کی سطح بتدریج گرتی جاتی، وسعتیں سمٹ جاتیں۔ ریت کی تہیں یوں اُبھر آتیں جیسے اس مقام سے پانی کا کبھی گزر نہ ہوا تھا کوئی تھر تھا، ریگستان تھا۔ دریا کے دونوں کناروں کے مابین کچے کی گاڑیاں، پک وین۔ وین فراٹے بھر رہی تھیں۔ جہاں کہیں گہرا پانی راستہ روک دیتا، کشتیوں کا پل بن جاتا۔ زندگی کو دوام تھا، خشکی اور پانی کی کش مکش ازل سے جاری تھی۔

چترال میں رات بھی عجیب ہے خصوصاً جب دریا کے کنارے گزاری جائے۔ شور وغوغے کے حوالے سے کبھی تو سمندری لہروں کی اُٹھان کا گمان ہونے لگتا۔ لہریں جو ساحل سے ٹکراتیں، میلوں پھیلی ریت کو نمدار کرتیں اور پھر نامراد واپس سمندر کی کوکھ میں لوٹ جاتیں۔ لیکن یہاں ازل سے تند و تیز لہروں کا پتھریلی چٹانوں سے کاٹ دار کھیل جاری تھا۔

شام ڈھلے ریلنگ تھامے میں نے دریائی منظر کو نظروں میں سمیٹا تو یہ صورت رانگا مستی جھیل کے خوبصورت منظر میں ڈھل گئی۔ جھیل کے ایسے ہی سلسلے تھے جنہوں نے لکڑی کے تختوں پر بنے ریسٹ ہاؤس کو گھیر رکھا تھا۔ شام گئے کشتی کھیتے مانجھی کے چہرے پر پھیلے سکون و طمانیت کو میں کیسے بھول پاتا اور یہاں دوپہر ڈھلے جب میں بھرے بازار سے گزرا تو ایک ادھیڑ عمر شخص کو جو اپنی خشخشی داڑھی کو بار بار کھجا رہا تھا ایک چبوترے پر خضوع سے بیٹھے دیکھا۔ اُس نے میلی گدیلی ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ سر پر چترالی ٹوپی پہنے کسی گہرے سوچ میں غرق تھا۔ کیا معلوم کائنات کی کوئی گتھی سلجھا رہا تھا۔ ممکن تھا اُسے آنے والے دن کی فکر ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ سورج کی ڈھلتی کرنوں کی لطیف تمازت سے لطف اندوز ہو رہا ہو۔ وہ بڑی دیر سے سڑک پر نظریں ٹکائے بیٹھا تھا۔ گاہے بہ گاہے دائیں بائیں دیکھ لیتا۔ اُس نے میری موجودگی کا بظاہر کوئی نوٹس نہ لیا۔ وہ سٹل لائف (Still Life) کا نمونہ لگ رہا تھا۔ ایسا کردار جسے حوماضت کا فرانسیسی سکیچ ڈیزائینر گھیر لیتا ہے۔ کاغذ پر لکیریں کھینچ کر پلوں میں اُس کا پورٹریٹ بنا کر اُس کے ہاتھ تھما دیتا ہے اور پچاس ساٹھ فرانک اینٹھ لیتا ہے۔ لیکن یہاں اس وقت کوئی پینٹر اور ڈیزائینر

نہ تھا۔ اُس شخص نے مجھے ایک نظر دیکھا اُسے میری موجودگی اور ڈھکے چھپے تجسس کا احساس ہو چلا تھا۔ وہ میرے ہونے اور نہ ہونے سے قطع نظر ایک بار پھر خلاؤں میں گھور رہا تھا۔ اُس کے چہرے سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ اُس کے من میں شانتی تھی یا پھر کسی گہری فکر نے آن گھیرا تھا۔

اس وقت ہم چار افراد ڈبل کیبن میں سوار تھے۔ ہمارا ڈرائیور پُر پیچ چترالی راستوں کا شناسا تھا۔ کچھ زادِ راہ بھی ساتھ تھا۔ ڈرائیو نے ایکسیلیٹر پر پاؤں دبایا۔ ہمارا رُخ دروش کی سمت تھا۔ اس سے کچھ ہی آگے لواری پاکی کا علاقہ شروع ہو جاتا جہاں سے آگے بالائی دیر کا علاقہ تھا۔ ہماری منزل تو وادیِ کیلاش تھی، بومیرد کی وادی۔ شہر سے نکلتے کچھ وقت صرف ہوا، کھوکھے، سڑک کنارے چائے خانے، دوکانداروں کی تجاوزات، منیاری، کریانے، سبزی اور قصابوں کے تھڑے۔ کھونٹیوں سے لٹکے ذبح شدہ بکرے کا گوشت، سرخ سپید رنگ والے قصاب بڑی مہارت سے گوشت کاٹ رہے تھے۔ میرے سوال پر میرا میزبان ڈاکٹر قیوم بتا رہا تھا کہ گوشت کا کاروبار ان دنوں افغانی کر رہے تھے۔ گوشت ہی کیا ٹرانسپورٹ کا کاروبار، ہوٹل، چمڑے کا بزنس، روزمرہ کی مزدوری۔ ان دنوں یہاں ہر طرف افغان مہاجرین ہی مصروفِ کار نظر آ رہے تھے۔

شہر سے نکلے تو ڈرائیور نے ڈبل کیبن کی رفتار تیز کر دی۔ کچھ ہی دیر میں پہاڑی سلسلہ شروع تھا۔ سڑک کے ایک طرف بلند پہاڑ اور دوسری طرف نشیب میں بہتا دریا اور کشادہ وادیوں کے سلسلے تھے۔ یہ ایوّن کی وادی ہے، ڈاکٹر قیوم نے اپنی اُنگلی سے اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے ایک موڑ کاٹا اور گاڑی کو نشیبی راستے پر اُتار دیا۔ ہم اس وقت ایوّن کی وادی میں داخل ہو چکے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد ہم اپنے پہلے پڑاؤ پر رُکے۔ ایک بیٹھک تھی جہاں کچھ دیر کے لیے ستائے۔ چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ مقامی میزبان گرم گرم مکسڈ چائے لے کر آ گیا۔ عجب ذائقہ دار چائے تھی۔ الائچی میں گھلی ملی۔ ہمارے میزبان نے محض چائے ہی پر اکتفا نہ کیا بلکہ اخروٹ، بادام، کش مش اور کالے انگور سے بھی تواضع کی۔

(جاری ہے)

◆◆◆

کہتے ہیں ویران گھروں میں کوئی نہیں آتا مہماں
پھر کیوں تیری یاد نے میرے دل میں ڈیرے ڈالے ہیں

(اظہر جاوید)

بیتے کل کا اِک اِک پل

.....15.....

نذیر فتح پوری (انڈیا)

یادِ ماضی عذاب ہے یا رب
چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

میرے لئے ماضی کی یادیں بہت کم عذاب کا سبب بنی ہیں۔ حالاں کہ میرا بچپن ایک طرح سے عذاب ہی میں گزرا ہے۔لیکن آج عمر کے اس پڑاؤ پر جب میں اپنے بچپن کو قلم بند کر کے حرفوں میں قید کر رہا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ بچپن کا زمانہ قطعی عذاب نہیں تھا۔اس زمانے کے مقابلے میں آج زندگی ہزار گنا زیادہ عذابوں میں مبتلا ہے۔ بے ایمانی، بد دیانتی، نافرمانی، دھوکا، فریب، بے حسی، بے بسی اور نہ جانے کیسی کیسی سفاکیوں اور نامرادیوں سے روزانہ سابقہ پڑتا ہے۔

نیکیاں بوئیں اور بدی پائی
ہم نے یہ کون سی صدی پائی

آج زندگیوں میں بظاہر عیش و آرام نظر آتا ہے لیکن اندر کی تہوں میں اتر کر دیکھیں تو ایک چھوٹی موٹی قیامت کا منظر دکھائی دیتا ہے۔ دل میں ٹوٹ پھوٹ، روح میں اضطراب، سانسوں میں بلا کا انتشار، سوچوں میں سکڑاپن، فکروں میں شعلگی، اجنبیت کا خوف چاروں طرف ریگستان کی طرح پسرا ہوا، یہاں تک کہ گھر کے در و دیوار بھی اکثر پرائے لگنے لگتے ہیں۔ چھت کی سمت نظر اٹھایئے تو بے یقینی کا پنکھا گھر گھر کرتا ہوا سماعت میں خوف انڈیلتا لگتا ہے۔ سب کچھ اپنا ہوتے ہوئے بھی اپنا کچھ نہیں، اندر سناٹا، باہر تنہائی۔ بس ایک وہ ہے جو پچاس برس پہلے نکاح کے دو بول بول کر میرے دامن سے وابستہ ہوئی تھی۔ وہ آج تک میرے دکھوں کی شریک ہے۔ میری زندگی کا لباس، میری آبرو کی محافظ، ماں کے بعد بس ایک یہی عورت ہے جو میری ڈھارس بندھاتی رہتی ہے۔ امیدوں کے دھاگوں سے مستقبل کے سنہری خواب باندھ کر میرے ہاتھوں میں تھماتی رہتی ہے۔ زخم بھول کر میرے زخموں پر مرہم پٹی کرتی جاتی ہے۔ جس نے غربت کے سبب اپنی زندگی میں کبھی سکھ کا سپنا نہیں دیکھا اور آج تک زندگی کے الاؤ سے اپنے ہاتھ سینک سینک کر خود کو پگھلنے سے بچاتی رہی ہے۔ کثیر العیالی کے سبب کبھی دل برداشتہ اور سنجیدہ خاطر نہیں ہوئی۔

رشتے ناتوں کا نبھانا جیسے اس کی زندگی کا نصب العین بن چکا ہو۔ان پڑھ، الف سے سے نا آشنا، جیم اور دال سے کوسوں میل کی دوری، لیکن کبھی کبھی ایسے بلیغ مکالمے اس کی زبان سے نکل جاتے ہیں کہ پچاس کتابوں کے مصنف کے ہاتھوں سے قلم چھوٹ جاتا ہے۔زندگی کی ناہمواریوں اور قسمت کی بیماریوں پر صبر کرنا پہلے اپنی ماں سے سیکھا اور اب اپنی اولاد کو سکھا رہی ہے۔گویا سیکھنے کا عمل آج بھی جاری ہے۔

بات ماضی کی ہو رہی ہے۔میں حال میں کیوں چلا آیا۔ابھی تو میں بچپن کی گلیوں میں انگلی تھامے گھوم رہا ہوں۔میں نے بار بار کوشش کی کہ جلد سے جلد، بچپن کی ان معصوم باتوں کے حصار سے نکل آؤں لیکن ان کرداروں کا کیا کروں جن کو زندگی دینے کا عمل ابھی باقی ہے، جن کا تصور احتجاج کی رو بن کر قلم کی نوک کو کاغذ کی طرف کھینچنے لگتا ہے۔بس چند نام، ہلکے، چھوٹی چھوٹی یادوں کے ساتھ، ذرا ذرا سے واقعات کے ساتھ ماضی کی چلمن سے یادوں کی منڈیروں پر کسی بے ضرر کبوتر کی طرح پنکھ پکھرا کر اپنی موجودگی کا احساس دلائے یہ کردار ملاحظہ کئے جاسکتے ہیں۔ان میں ایک کردار فقیر بادشاہ کا ہے۔

سراج بادشاہ

ایک بار کسی دینی مجلس میں ایک مولوی صاحب کی زبانی سن لیا تھا کہ (حدیث کے حوالے سے اگر کوئی گھوڑے پر سوار ہو کر بھی آپ کے دروازے پر سوال کرے تو اس کا سوال پورا کرو، الفاظ دوسرے ہو سکتے ہیں لیکن مفہوم یہی تھا.....مولوی صاحب صدقہ اور خیرات کے موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔میرے معصوم ذہن نے ایک سوال کھڑا کر دیا۔''بھلا گھوڑے پر آنے والا سوالی بن کر کسی کے دروازے پر دستک کیوں کر دے سکتا ہے؟ لیکن میں نے یہ بات ان کے سامنے نہیں کہی۔بس خدا ہی اس کا گواہ ہے۔کئی دنوں بعد جب ہم محلّہ زمینداران والے گھر سے عیدگاہ اسکول والے اپنے گھر میں منتقل ہو گئے تو ایک دن صبح صبح ایک سائل نے دروازے پر صدا لگائی۔میں حسبِ معمول جب آٹا لے کر دروازے پر گیا تو میری معصوم حیرتوں نے انتہاؤں کو چھو لیا۔آج جو سائل دروازے پر موجود تھا، وہ گھوڑے پر سوار تھا۔اس نے کپڑے سفید شلوار اور قمیض پہن رکھے تھے۔اوپر سے سیاہ جیکٹ، سر اور داڑھی کے بال سیاہ، ہاتھ میں گھڑی باندھ رکھی تھی۔گلے میں غالباً موتیوں کی مالا تھی۔ایک ہاتھ میں جھولی اور دوسرے ہاتھ سے گھوڑے کی لگام تھام رکھی تھی۔گھوڑے کی گردن اور پیٹھ کے درمیان ایک بیساکھی آڑی رکھی تھی۔میں نے جب اس کے پیروں کی جانب دیکھا تو رکاب میں لگے دونوں پیر بہت کمزور نظر آئے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دونوں پیروں سے معذور تھا۔مجھے مولوی صاحب کی بیان کی ہوئی حدیث یاد آ گئی اور میرے معصوم ذہن میں کلبلاتے سوال کا مجھے جواب مل گیا۔وہ سوالی آٹا اپنی جھولی میں ڈال کر دوسرے دروازے کی جانب بڑھ گیا۔اس کے بعد برسوں تک وہ ہمارے دروازے پر دستک دیتا رہا، اور میں خوشی خوشی دوڑ کر اس کی جھولی میں آٹا ڈالتا رہا۔

بعد میں معلوم ہوا کہ سوالی کا نام سراج اور والد کا نام عبدالغنی تھا اور والدہ رحمت تھی۔ ویسے والدہ اولاد کے لئے رحمت ہی ہوتی ہے۔ یہ الگ بات کہ بڑی ہو کر اولاد اسے زحمت میں ڈال دیتی ہے۔

کچھ دنوں بعد سراج نے اپنے گھوڑے کے ساتھ ایک تانگہ بھی باندھ لیا تھا۔ تانگے کو اس نے بادشاہ کا نام دیا تھا اور دھیرے دھیرے فتح پور کے بازار میں وہ بادشاہ کے نام سے مشہور ہو گیا تھا، بادشاہ نے شادی ضرور کی تھی لیکن اس کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اب اس نے محلے کے گھروں کے دروازوں پر جا کر سوال کرنا چھوڑ دیا تھا اور بازار کی دکانوں پر سوال کرنے لگا تھا۔ بازار میں تقریباً سبھی لوگ بادشاہ کے نام سے آشنا تھے، اس لئے اسے سوال کرنے کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی تھی، بادشاہ کا تانگہ دیکھتے ہی دکان دار روپیہ دو روپیہ پہلے ہی نکال کر تیار رکھتے اور دوپہر تک بادشاہ کی جیکٹ کی جیب میں بہت سے روپے جمع ہو جاتے۔ بادشاہ کا گھر چوں کہ تیلیوں کے محلّہ میں تھا جو فتح پور کے بازار سے تین چار کلومیٹر کی دوری پر تھا۔ دوپہر میں گھر لوٹتے وقت بادشاہ گھوڑے کے لئے گھاس خریدتا اور گھر کے لئے کھانے پینے کا سامان۔ ویسے گھر میں کھانے پینے والے بھی کون تھے۔ ایک بادشاہ، ایک اس کی بیوی اور ایک گھوڑا۔ ممکن ہے گھر میں بادشاہ نے بکریاں پال رکھی ہوں۔ ان دنوں فتح پور کے ہر گھر میں ایک بکری ضرور ہوا کرتی تھی۔ ایک بیان کے مطابق 2001ء تک بادشاہ زندہ تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے مالک حقیقی سے جا ملا۔ اس کے بعد میں نے بادشاہ کو تب تب ہی دیکھا، جب جب میں پونے سے فتح پور دو چار دن کے لئے جاتا تھا۔ بادشاہ بازار میں تانگے پر سوار گھومتا نظر آتا۔ عوام سے بھی اس کی اچھی یاری تھی۔ کچھ لوگ اسے دیکھ کر فقرے بازی کرتے تو بادشاہ ترکی بہ ترکی ان کے فقروں کا جواب دیتا۔ لیکن مہذب انداز میں، میں نے کسی فقیر کی اتنی عزت اور مقبولیت نہیں دیکھی جتنی بادشاہ کی دیکھی۔

آج بھی بادشاہ کے لئے میرے دل میں اس لئے جذبۂ تشکر موجود ہے کہ اس کی وجہ سے حدیث کا مفہوم ہی نہیں سمجھا بلکہ وہ سراپا کردار بن کر نمودار ہوا، اور میرے اعتماد کو مزید اعتماد بخش گیا۔ یہاں مجھے اپنی غزل کا ایک شعر یاد آ رہا ہے ؎

فقیر کب کا چلا گیا ہے گلی میں لیکن صدا ہے روشن

پیروں فقیروں سے بچپن ہی میں انس پیدا ہو گیا تھا۔ حالاں کہ گھر کا ماحول قطعی ایسا نہیں تھا۔ جہاں کسی قسم کی شدت پسندی موجود ہو۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ گھر کے لوگ پڑھے لکھے نہ تھے۔ دینی اور دنیاوی دونوں طرح کی تعلیم سے کورے تھے۔ علیم خان جوڈ کے خاندان میں پہلا بچہ تھا جس کا نام اسکول کے رجسٹر میں پہلی بار درج ہوا تھا۔ ایسے میں مذہبی امور کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ مذہب کے نام پر پڑھے لکھے لڑتے ہیں۔ حالاں کہ میرے بچپن کا ایک حصہ درگاہ حاجی نجم الدین کے صحن میں کھیلتے اور پڑھتے ہوئے ضرور گزرا، لیکن بچپن ہی سے غیر شرعی رسومات دل کو نہیں جچتی تھیں۔ نماز کے علاوہ کہیں اور سر نہیں جھکایا۔ اس کے بعد اللہ والے کی تلاش ہمیشہ جاری رہی۔''

(جاری ہے)

◆◆◆

رحم عالی جاہ، رحم!

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

ہماری تو کیا بساط کہ ایسی بقراطیت جھاڑ سکیں، ایک مغربی مفکّر نے کہا تھا کہ انسان کا ذہن اس کی پیدائش کے ساتھ ہی کام کرنا شروع کر دیتا ہے اور صرف اس وقت رکتا ہے..... جب وہ تقریر کے لیے مائک پر آتا ہے۔

ہمیں اس قول کی صداقت کا اندازہ کچھ عرصے قبل آرٹس کونسل (کراچی) کی ایک ادبی تقریب میں شرکت کے بعد ہوا، جو ہمارے شہر کی ایک ذہین اور پرگو شاعرہ کے مجموعہ کلام کی اجرائی کے سلسلے میں منعقد ہوئی تھی۔ حاضرین کی تعداد کے لحاظ سے تو یہ ایک کامیاب تقریب تھی لیکن کتاب پر گفتگو کرنے والوں نے اس روز سامعین سے نہ جانے کب کے بدلے چکائے کہ لوگ سن سن کر سن ہو گئے لیکن وہ بول بول کر ''کنگ'' نہ ہوئے۔

تقریب کے پہلے مقرّر نے پانچ سات منٹ کا مختصر خطاب کر کے اپنی ڈائری اور سامعین کی دعائیں سمیٹ لیں۔ اس سے قبل کہ دوسرے صاحب اپنی کھاتا کھولتے، ناظم تقریب نے پچھلے کی شریفانہ مثال کا حوالہ دیتے ہوئے آگے آنے والوں سے اختصار کی دردمندانہ اپیل کی اس لیے کہ جلسہ گاہ سے ملحقہ سبزہ زار میں ایک ڈیڑھ گھنٹے بعد محفل موسیقی بپا ہونے والی تھی۔ دوسرے مقرّر کے بارے میں بتایا گیا کہ وہ اسلام آباد سے بذریعہ طیّارہ، خاص طور پر اس تقریب میں شرکت کے لیے ایر پورٹ سے سیدھے یہاں تشریف لائے ہیں۔ اس پر زوردار تالیاں بجیں جن سے حوصلہ پا کر انھوں نے اپنے بریف کیس سے لگ بھگ پچیس صفحے کا مضمون برآمد کیا جو بقول ان کے، جہاز میں دورانِ پرواز لکھا گیا تھا۔ انھیں اس مبالغہ آرائی کی بھی داد مل گئی حالانکہ یہ عملاً ناممکن تھا۔ اب انھوں نے مضمون شروع کیا۔ وہ تقریباً ہر پیراگراف کے بعد اپنے موقف کی تائید میں شاعرہ کے کم از کم بیس اشعار تحت اللفظ مشاعرہ کے انداز میں پڑھتے اور بار بار اسٹیج پر بیٹھے ہوئے ''خواص'' کی طرف داد طلب نظروں سے دیکھتے جو شرما حضوری میں سر ہلا کر مہمان نوازی کے تقاضے نبھاتے۔ معلوم ہوتا تھا وہ پورا کلام سنا کر سامعین کے صبر وضبط کا امتحان لے رہے ہیں اور بے چاری شاعرہ اپنی باری پر اظہارِ تشکر کے بعد صرف اتنا کہے گی کہ ''کتاب تو آپ لوگ سن ہی چکے ہیں۔'' موصوف کم وبیش پون گھنٹے تک سامعین کے سینوں پر مونگ دل کر اس وقت ہٹے جب خود ان کا حلق خشک ہو گیا اور آواز میں نقاہت کے آثار نمایاں

ہونے لگے۔

کئی سال گزرے کراچی کلب میں مشتاق یوسفی صاحب کی زیرِ صدارت ''بیادِ ضمیر جعفری'' ایک تقریب منعقد ہوئی تھی۔ نظامت ایک خاتون کر رہی تھیں جو ہر مقرر کو بلانے سے قبل ضمیر جعفری کے فن، شخصیت، اخلاق و کردار اور پیشہ ورانہ زندگی پر بصیرت افروز خطبہ دیتیں۔ آخر میں یوسفی صاحب کو صدارتی خطاب کی دعوت دیتے وقت وہ جعفری صاحب کی ایک مشہور نظم ''گنر شیر خان'' لے بیٹھیں۔ بولیں ''نظم بہت طویل ہے۔ میں بطور نمونہ اس کے صرف چالیس اشعار آپ کی سماعتوں کی نذر کرتی ہوں۔'' (شکر ہے ہم اپنا مضمون پہلے ہی پڑھ چکے تھے۔) پھر وہ نذر کرتی رہیں اور سامعین نظریں نیچی کیے بیٹھے رہے۔ رات دو بجے کے قریب محفل کو ادھ موا کرنے کے بعد جب محترمہ نے یوسفی صاحب سے صدارتی خطاب کی درخواست کی تو انھوں نے دو ٹوک الفاظ میں کہا ''اس وقت قوالی تو ہو سکتی ہے، صدارتی خطاب نہیں۔'' وہ خاتون تو اپنا فرضِ (غیر) منصبی ادا کر کے ادھر ادھر ہو گئیں لیکن منتظمین یوسفی صاحب کی منّت سماجت کرتے رہے۔ وہ بھی ٹس سے مس نہ ہوئے لہٰذا عشائیہ شروع ہوا جو بالآخر ''فجرانہ'' بن گیا تھا۔

ہم ایک بار پھر آرٹس کونسل کی تقریب کی طرف لوٹتے ہیں۔ اسلام آبادی صاحب کے بعد ایک پروفیسر صاحب ڈائس پر رونق افروز ہوئے۔ انھوں نے آغاز میں اس امر کی وضاحت بھی ضروری سمجھی کہ وہ کتابوں کی تقریبات میں ہمیشہ صاف گوئی سے کام لیتے ہیں۔ شاعر/ادیب کی تعریف سے گریز کرتے ہیں اور اسی لیے انھیں اس قسم کی محفلوں میں کم بلایا جاتا ہے کیوں کہ لوگ سچ سننے کے عادی نہیں۔ بحیثیت نقّاد اپنے مرتبے کے تعیّن میں وہ پندرہ منٹ کھا گئے۔ پھر انھوں نے اختصار کی اہمیت کا موضوع چھیڑا اور اس پر ایک طویل لیکچر دیا۔ پھر تنقیدی رویّوں پر سیر حاصل بحث کی۔ اس دوران حاضرین ان کے ہاتھوں میں موجود کاغذوں پر نظریں جمائے رہے۔ خیال تھا کہ وہ پھول بن کھلے مرجھا جائیں گے اور لوگوں کے چہروں پر رونق لوٹ آئے گی لیکن..... اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ پروفیسر صاحب آدھے گھنٹے کے ابتدائی خطاب کے بعد گویا ہوئے ''اب میں مضمون سنا رہا ہوں۔ میں درمیان میں کوئی کوئی پیراگراف چھوڑ کر آگے بڑھوں گا۔ لہٰذا آپ کو کہیں کوئی ذہنی جھٹکا لگے تو پلیز مائنڈ نہ کریں۔'' ہم نے دل میں کہا ''ہم ہر جھٹکے پر آپ کے حق میں دعائے خیر کریں گے۔''

خدا خدا کر کے انھوں نے مضمون پڑھنا شروع کیا۔ ابتدا ہی میں شاعرہ کی انتہائی جذباتی تعریف کی گئی تھی جس سے ان کے پہلے اصول کی نفی ہو گئی۔ دس منٹ تک وردِ پیراگرافوں میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ شاعرہ نے حزن و ملال کے مضامین کو کس طرح باندھا ہے۔'' پھر موصوف نے حزن و ملال کی تشریح شروع کر دی اور اس کا سلسلہ میر تقی میرؔ سے لے کر درجہ بدرجہ آرٹس کونسل میں بیٹھی ہوئی شاعرہ تک لے آئے۔ اگر شاعرہ سے ہماری ذاتی یاد اللہ نہ ہوتی تو ہم انھیں درمیان میں ٹوکتے ''حضور، بہتر ہوگا کہ آپ وہ حذف شدہ پیراگراف پڑھ کر ثوابِ دارین حاصل کر لیں۔''

حزن وملال کے تھکا دینے والے بیان کے بعد انھوں نے پھر اپنی نظریں مضمون پر جما دیں۔ پڑھتے پڑھتے تھوڑی دیر بعد رکے۔ پھر ارشاد ہوا ''یہاں آپ کو ذرا بڑا ذہنی جھٹکا لگا ہوگا کیوں کہ میں نے تین پیراگراف حذف کیے ہیں۔'' پھر خود ہی ''جھٹکا زدہ'' پیراگرافوں کا ''تفصیلی خلاصہ'' پیش کرنے لگے۔ پہلے میں شاعرہ کے نظریہ حسن، دوسرے میں فلسفۂ حیات اور تیسرے پیراگراف پر (پڑھے بغیر) روشنی ڈال رہے تھے تو پنڈال میں اچانک اندھیرا چھا گیا۔ اس روز ہمیں لوڈ شیڈنگ ایک نعمتِ غیر مترقبہ محسوس ہوئی اور ہم خاموشی سے سٹک لیے حالاں کہ وہاں ابھی بہت کچھ باقی تھا۔

تقریر اگر سامعین کے لیے ''تعزیر'' بن جائے تو اس پر ساحرؔ کا یہ مصرع صادق آتا ہے کہ ''تعلق روگ بن جائے تو اس کا توڑنا اچھا۔'' مقررین مائک پر اس طرح قبضہ کر لیتے ہیں جیسے یہ ان کی زوجہ محترمہ جہیز میں لائی تھیں یا والدِ بزرگوار ورثے میں چھوڑ گئے تھے۔ دو تین سال گزرے، ہمیں ''خصوصی بچوں'' کی بحالی کے ایک ادارے کی سالانہ تقریب میں بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کا اتفاق ہوا۔ صدارت ایک پروفیسر صاحب کی تھی جنھوں نے اسٹیج پر بیٹھتے وقت ناظم تقریب کو اپنا پانچ صفحے کا کوائف نامہ تھما دیا تاکہ وہ ان کے خطاب سے پہلے بطورِ تعارف پڑھ کر حاضرین محفل پر ان کی علمیت کی دھاک بٹھا دیں۔ چوں کہ بچوں کے مختلف پروگراموں اور تقریروں میں بہت وقت صرف ہو چکا تھا لہٰذا انھیں مطلوبہ تعارف کے بغیر ہی عزت و احترام کے ساتھ صدارتی خطبے کے لیے بلا لیا گیا۔ صدر صاحب قدرے بے کیفی کے عالم میں اٹھ کر مائک پر آئے۔

اب ذرا ان کی فنکاری ملاحظہ کیجیے۔ اپنی تقریر میں منتظمین کی خدمات کی سرسری ستائش کے بعد اعمالِ صالحہ کی اہمیت کا ذکر چھیڑ دیا۔ ارشاد ہوا ''ایسے ہی فلاحی کام آخرت میں کام آئیں گے۔ وہاں پر ایک ایک سے اس کے اعمال کا حساب لیا جائے گا۔ مجھ سے بھی سوال ہوگا کہ دنیا میں کیا کیا؟ وہاں میں یہ نہیں کہہ سکوں گا کہ میں تیس ناولوں کا مصنف تھا۔ میری شاعری کے پانچ اور افسانوں کے آٹھ مجموعے شائع ہوئے۔ تنقید کے موضوع پر میری ایک کتاب ایم اے کے نصاب میں شامل تھی۔ میں ریڈیو اور ٹی وی کے ادبی پروگراموں میں باقاعدگی سے حصہ لیتا تھا۔ مجھے فلاں فلاں ادبی تنظیم (نام گنوائے) نے ایوارڈز سے نوازا تھا.....'' غرض اس طرح ناظم تقریب کو دیا ہوا پورا کوائف نامہ لفظ بہ لفظ سنا کر تنبیہہ کے انداز میں گرج کے بولے ''عزیزانِ گرامی، آخرت میں یہ سب کچھ نہیں چلے گا۔ وہاں تو ایسے اعمال کام آئیں گے جیسے ہمارے یہ ڈاکٹر صاحب کر رہے ہیں.....'' اس روز ہمیں قتیلؔ اور کرامات والا شعر بہت یاد آیا۔

ہمارے ناقص علم کی رو سے دنیا کے کسی بھی ملک میں ''انجمن انسدادِ بے رحمی سامعین'' کا کوئی وجود نہیں (اگرچہ جانوروں کے لیے ایسی انجمن ہر جگہ موجود ہے)۔ اس کے لیے مہمانوں کو ''اپنی مدد آپ'' کے اصول پر خود ہی کچھ کرنا ہوگا۔ ہماری تجویز ہے کہ ادبی تقریبات کے شرکا اپنے ساتھ چھوٹے چھوٹے پلے کارڈ لے کر جایا کریں۔ جوں ہی کوئی مقرّر اعصاب پر سوار ہونے کی کوشش کرے، وہ پلے کارڈ اسے دکھائیں جن پر تحریر ہو..... ''رحم عالی جاہ، رحم!''

◆◆◆

رُوح افزا اور کیا چاہیئے!

برموسم کا مشروب

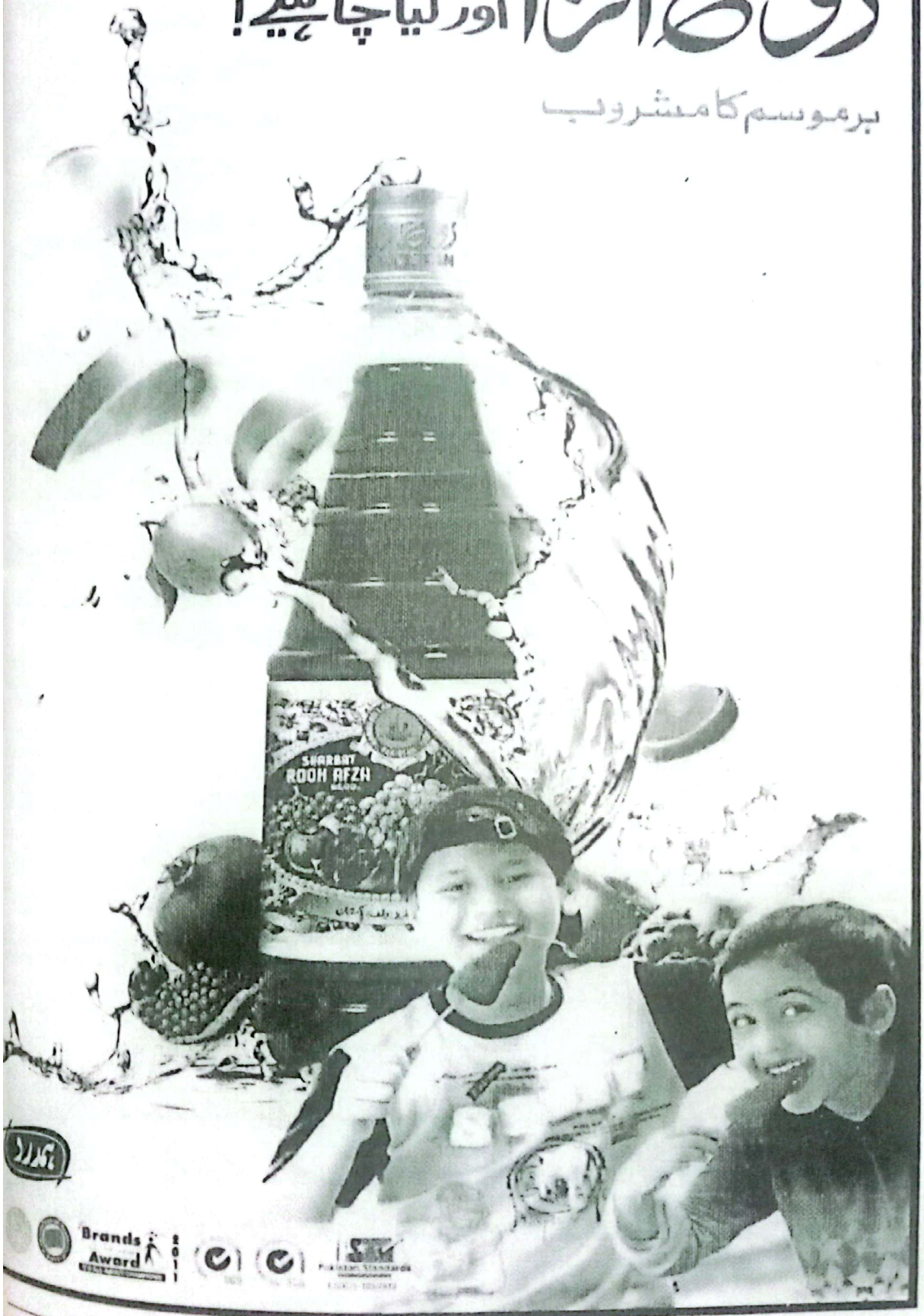

Brands Award 2011

گوشۂ اظہر جاوید

سارا شہر ہوا تھا دشمن، بات فقط تھی اتنی سی
کیوں اِک شخص نے ہم پہ اظہرؔ، نگہہِ کرم فرمائی تھی

اظہر جاوید

اظہر جاوید سے پہلی ملاقات

شہزاد احمد

وہ زمانہ بھی عجیب تھا، میں نے پہلا ایم۔اے، نفسیات کے مضمون میں 1952ء میں کیا۔نوکری نام کی چیز کہیں موجود نہ تھی۔مضمون بھی ایسا تھا جسے لوگ پڑھنے سے گریز کرتے تھے۔انھیں لگتا تھا کہ یہ کوئی غیب کا علم ہے، جو نفسیات پڑھ لے وہ چہرہ دیکھ کر دل کا حال بتا سکتا ہے، حالاں کہ نفسیات دان اور ڈاکٹر یا حکیم میں کوئی بنیادی فرق نہیں ہوتا۔سب کو مریض کی کیفیّت، مریض ہی سے معلوم کرنا پڑتی ہے۔اُس زمانے میں قابلِ قدر نوکری ریڈیو پاکستان کے پروڈیوسر کی ہوتی تھی۔اُس کے لیے بھی میں نے کوشش کی لیکن وہاں بھی بات نہ بنی۔لہٰذا دوبارہ گورنمنٹ کالج میں ایم۔اے فلسفہ میں داخلہ لیا اور پھر سے پڑھائی شروع کر دی۔ بالآخر ایک آرٹیکل رائٹر کے طور پر تھل ڈویلپمنٹ اتھارٹی (TDA) میں ایک ملازمت مل گئی اور پہلی پوسٹنگ جوہر آباد میں ہوئی جہاں ٹرین رات کو دو بجے پہنچتی تھی۔ میں سٹیشن پر اُتر گیا لیکن مجھے وصول کرنے والا کوئی نہ تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد ایک جونیئر کلرک آئے اور ایک ریسٹ ہاؤس میں ایک خالی چارپائی عنایت فرما کر چلے گئے۔

اُس شہر کی رونق اُس وقت بزرگ شاعر جوہر نظامی تھے جو اُستادوں کے اُستاد تھے۔اُن کے ایک اور بھائی راجہ علی گوجر بھی تھے جو سرگودھا میں ایک پرائمری سکول میں پڑھاتے تھے، لیکن شاعر اتنے اچھے تھے کہ جب کوئی مشاعرہ ہوتا تو لاہور سے متعلق شعرا ہمیشہ اُنہی کا ذکر کرتے تھے۔تاہم جوہر نظامی صاحب کی دفتری حیثیت بھی بڑی دلچسپ تھی۔وہ وہاں کی ایڈمنسٹریشن یعنی انتظامی معاملات کے انچارج تھے اور شاعر ہونے کی وجہ سے اُن کا بہت احترام کیا جاتا تھا۔اُن کے بیٹے تو شاید پانچ تھے۔مگر ان میں سے دو بہت اچھے شاعر تھے۔ایک بیٹا حسن اختر جلیل بعد میں ڈپٹی کمشنر بھی ہوا اور کم عمری میں اُس کا انتقال ہو گیا۔ جوہر آباد بالکل ہی نیا شہر تھا۔سوائے ایک چائے خانے کے اور دو تین معمولی دکانوں کے وہاں اور کچھ نہ تھا۔شام کو چائے خانے پر وہاں کے لکھنے والے اکٹھے ہو جاتے تھے۔ایوب خان کا مارشل لاء نیا نیا لگا تھا۔ چائے کی پیالی ایک آنے میں ملتی تھی لہٰذا ایک روپے میں تمام شاعروں کو بھگتایا جا سکتا تھا۔چھٹی اتوار کی ہوتی تھی۔ اتوار کو شہر بے رونق ہو جاتا تھا۔ کچھ لوگ خوشاب اور باقی لوگ سرگودھا چلے جاتے تھے۔ وہاں پہلی بار میری ڈاکٹر وزیر آغا صاحب سے ملاقات ہوئی تھی جو بہت بڑی گاڑی میں میرے چھوٹے سے دفتر میں ملنے آئے تھے اور لوگوں کو حیرت زدہ کر دیا تھا۔اُن کی دعوت پر میں ایک ہفتے سرگودھا گیا، جوہر نظامی صاحب میرے ساتھ تھے۔

جوہر نظامی صاحب اور میں ایک بہت معمولی سے ہوٹل میں اپنی اپنی چارپائی پر لیٹ گئے۔ پھر ایک صاحب اُن کو ملنے کے لیے آئے جو نوجوان تھے، خوش شکل تھے اور بہت تیز اور تیکھی باتیں کرتے تھے۔ یہ اظہر جاوید تھے۔ بلاک کا نام تو مجھے یاد نہیں لیکن مرکزی مسجد کے قریب ترین کسی بلاک میں رہتے تھے۔ رات کے کھانے کا بندوبست، جسے پُرتکلف ہی کہنا چاہیے انھوں نے اپنے گھر پر کیا تھا۔ رسمی طور پر نہ سہی مگر بہت حد تک جوہر نظامی اُن کے استاد تھے اور وہ اپنے استاد کا بے حد احترام کرتے تھے لہٰذا ہم دیر تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ رات بھی اُنھی کے گھر میں بسر کی۔ شعروشاعری کا دور چلا۔ اظہر جاوید کے بڑے بھائی جو اُن سے بہ مشکل ایک دو برس بڑے ہوں گے وہ بھی جوہر آباد میں تھے۔ اُن سے بھی ملاقات رہی۔ پھر ایک زمانے تک مظہر جاوید یعنی اظہر جاوید کے بڑے بھائی اور میں ایک ہی مکان میں کوئی ایک برس تک مقیم رہے۔ اپنے محدود وسائل کے باوجود اظہر جاوید جب کبھی جوہر آباد آتے یا ہم سرگودھا جاتے (دونوں کے درمیان فاصلہ کوئی 30 میل کا ہوگا) ہمیشہ بل ادا کرنے پر اظہر جاوید اصرار کرتے۔ شاعری کا ابھی آغاز تھا۔ شعر لکھتے ضرور تھے مگر رفتار بہت تیز نہیں تھی۔ لیکن شاعری کے اسرار و رموز کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں نے شکیب جلالی کو آرٹیکل رائٹر بنوا دیا تھا کیوں کہ خود میری ترقی ہوگئی تھی۔ اور 1959ء کے آخر میں جب میں نے نوکری چھوڑی تو اپنی جگہ الطاف پرواز کو نوکری دلائی۔ جو اُس دور میں ایک روزنامے کے ایڈیٹر تھے۔ بعد میں وہ راول پنڈی چلے گئے اور وہیں اُن کا انتقال ہوا۔ مجھے ٹھیک سے یاد نہیں کہ اظہر جاوید کب لاہور منتقل ہوئے تھے اور کب سے انھوں نے ''تخلیق'' نکالنا شروع کیا تھا۔ البتہ یہ یاد ہے کہ ''تخلیق'' کا دفتر پاک ٹی ہاؤس کے بے حد قریب تھا اور اظہر جاوید کا سارا دن لوگوں کے چائے کے بل ادا کرنے میں گزرتا تھا۔

اظہر جاوید کے ایک ماموں، جن کا نام مجھے یاد نہیں۔ جناب تجمل حسین (برادر الطاف گوہر) کے بہت قریبی دوست تھے اور تجمل حسین تو بہت بڑے افسر تھے۔ پہلے مغربی پاکستان کے انکم ٹیکس کے کمشنر پھر سیکرٹری فنانس ہوگئے۔ اظہر جاوید کو اُس زمانے میں اشتہاروں کی کمی نہیں تھی۔ اُس کا مشکل دور اُس وقت آیا جب ان کے دفتر کی عمارت گرا دی گئی اور وہ بھگوان داس سٹریٹ میں ایک چھوٹے سے دفتر میں منتقل ہوگئے۔ تاہم انھوں نے وضع داری قائم رکھی اور برس ہا برس ''تخلیق'' کا بار اُٹھائے رکھا۔ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ اتنا سارا بوجھ اکیلے کیسے اٹھا لیتے تھے کیونکہ اُنھوں نے کبھی کسی سے مدد قبول نہیں کی تھی۔ دو ایک بار ایسے مواقع آئے جب میں نے اُن کے لیے مالی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ اُس پر راضی نہ ہوئے۔ اُن کی وضع داری آخری دم تک قائم رہی۔ ایک زمانے تک اظہر جاوید، میں اور الحمد کے منتظم، مالک صفدر صاحب تقریباً ہر شام کو الحمد کے دفتر میں اکٹھے ہوتے تھے۔ پھر ایک زمانے میں ہماری ملاقاتیں کم کم ہونے لگیں اور پھر ایک دن اظہر جاوید دنیا سے اُٹھ گئے اور محسوس ہوا کہ کیا کریں زندگی ہے ہی ایسی مصروف چیز مگر اظہر جاوید جیسے مستحکم انسان کم کم پیدا ہوتے ہیں۔

(شہزاد احمد یکم اگست 2012ء کو وفات پا گئے۔ یہ ان کی آخری تحریر ہے)

◆◆◆

پیا دیکھن کی آس.....اظہر جاوید کے لیے

ڈاکٹر ابدال بیلا

لدھیانے سے بلاوا آیا، تو میں زمین سے ڈھائی انچ اوپر چلنے لگا۔ اس کی تین وجہیں تھیں۔ پہلی وجہ تو یہ کہ لدھیانہ میری ماں کا شہر ہے۔ میرے ابّا جی کا گاؤں ''ماؤ میووال'' لدھیانے سے دس میل پرے جالندھر ضلعے میں ہے۔ اسی گاؤں کے ''سائیں بگو شاہ'' ایک عظیم روحانی بابے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی، کہ اس سفر میں اظہر جاوید میرا ہم سفر طے ہوا تھا۔ لدھیانے کی طرف سفر میرے لیے اپنے ناول ''دروازہ کھلتا ہے'' کی طرف کا سفر تھا۔ لدھیانہ اس ناول کا مرکزی شہر ہے۔ جیسے پرکار کی نوک رکھ کے دائرہ لگایا جاتا ہے، ایسے ہی لدھیانہ پہ پرکار رکھ کر اگر سارک کے آٹھ ملکوں کا دائرہ لگایا جائے تو ''دروازہ کھلتا ہے'' کا سارا علاقہ بنتا ہے۔ اس شہر کو برسوں میں نے سنا، سوچا اور لکھا۔ امی جی اور ابا جی سے سنے قصوں کا سارا کاروان یہاں رکا پڑا تھا، جسے لکھ دیا۔ وہ کہانیاں سنا کے چلے گئے۔ ان کی روحوں سے ان کے جسم جھڑ گئے۔ مگر ان کی آنکھوں سے دیکھن سمے جو محبت بھرے ستارے چمکا کرتے تھے۔ وہ ستارے ادھر ہی رہ گئے۔ وہ ستارے میں نے لکھے۔ زندگی کے باہر جو بھی موسم رہا، یہ ستارے نہ اوجھل ہوئے۔ کسی بادل، دھوپ، دھول اور طوفان سے یہ ستارے نہ گرے نہ چھپے۔ یہ چمکتے رہے۔ راہ دکھاتے رہے۔

''پیا دیکھن'' کی آس والے یہ ستارے عجیب ہوتے ہیں۔ ان پہ نگہہ پڑتے ہی ان کی کیمسٹری بدلنے لگتی ہے۔ آنکھ کے شیشے کو یہ ایک لمحے کے سو ویں حصے میں بدل دیتے ہیں۔ شیشے پہ ہیرے کی چمک کا لشکارا ابھرتا ہے۔ ہیرے کی کنی جھلملاتی ہے۔ اسی لمحے کی ذرا سی بوند میں یہ اندر باہر کے سارے موسم بدل دیتے ہیں۔ موسموں کی سختیوں سے جھلسی روح، جیسے گنگا اشنان کر لیتی ہے۔ تیز دھوپ چھنا بند کر دیتی ہے۔ برف گلیشئر میں جمی ہوئی اعصابی تاریں جگنو شرارے چھوڑنے لگتی ہیں۔ طوفان اتر جاتے ہیں۔ زلزلے تھم جاتے ہیں۔ سونامی پلٹ جاتا ہے۔ اندر کی روح لمحہ بھر میں یوں تر و تازہ ہو جاتی ہے جیسے ابھی اس نے جنم لیا ہو۔ معصوم ہلکی اور لطیف۔ خوش بختی سے میرے نصیب میں ایسی کئی آنکھیں آئیں۔ یہ آنکھیں مجھے اپنے گرو ممتاز مفتی کی نگہہ میں نظر آتی تھیں۔ میں ان کے سامنے جاتا تو ہیروں کی طشتری پہ پڑا رومال جیسے سرک جاتا۔ جگمگ شہر میں رہتی اپنی بہن کی آنکھوں میں بھی ایسی چمک مجھے دِکھتی ہے۔ میرے چھوٹے بھائی بلال کے چہرے پہ بھی امی جی کی آنکھیں ہیں۔ ایسی ہی چمک

جہاں مجھے اپنے لیے ہمیشہ ٹھہری ہوئی منتظر نظر آتی وہ اظہر جاوید کی آنکھیں تھیں۔ اظہر جاوید کی آنکھوں میں اپنے دوستوں کے لیے ممتا والی، پالنے والی چمک تھی۔ پرانی انارکلی سے ہوتا ہوا، بھگوان سٹریٹ میں ''تخلیق'' کے کھلے دروازے پہ تنے پردے کے بیچ دروازے پہ دستک دیتا۔ دروازہ کھلتا ہے، پردہ ہٹتا ہے۔ میں دو قدم اس کے دفتر میں رکھ کے سلوٹ مارتا ہوں۔ اور اظہر جاوید ''بسم اللہ'' کا نعرہ مارتا ہوا، اپنی کرسی سے اٹھتا ہے۔ بازو کھول کے میری طرف لپکتا ہے۔ میں جھک کے اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگاتا ہوں۔ وہ بازو پھیلا کے مجھے لپیٹ لیتا ہے۔ میرا ماتھا چومتا ہے، سر سے پیر تک جیسے جھوم جاتا ہے۔ ''تیرا آنا مکہ تے مدینہ'' ''بسم اللہ''۔ کتابوں، رسالوں اور محبت بھرے خطوں کے انبار میں اس کا میز تھا، میز کے پیچھے کرسی جب اس کا کوئی دوست اس کے دفتر آ گیا۔ وہ اپنی کرسی کو جیسے بھول گیا۔ کبھی اٹھ کے کسی شیلف سے کوئی کتاب نکال کے دے رہا ہے۔ کہیں جھکا رسالوں کے بنڈل کھول کے کوئی رسالہ دکھانے یا دینے کے لیے ڈھونڈ رہا ہے۔ کونے میں پڑے چائے کے برتن اٹھا رہا ہے۔ کبھی اٹھ کے گئے ہوئے دوستوں کے کھائے ہوئے سموسوں کی پلیٹ دھونے بغلی دروازہ کھول کے جا رہا ہے۔ چائے کے کپ دھو کے لا رہا ہے۔ پیالیوں میں چائے ڈال رہا ہے۔ بسکٹ والی پلیٹ دوسرے کے آگے رکھ رہا ہے۔ اسے کسی دوست کے آنے سے ایسا چاؤ چڑھ جاتا، جیسے ماں جی کو کبھی کبھار، مدتوں بعد میکے سے آئے کسی پروہنے کو دیکھ کے چڑھتا تھا۔ پھر میری ماں بھی رسوئی اور دالان میں بھاگتی پھرتی۔ میں روحوں کے جسموں میں حلول کے نظریے کو ماننے والا تو نہیں، مگر ایسی کیفیت کا مشاہدہ کرنے والا ضرور ہوں۔ مجھے اپنی کئی عزیز ہستیوں کی روحوں میں اپنی ماں کی روح کے منتقل ہونے کا احساس ہوا ہے۔ جب کبھی کوئی ایسی ہستی، خدا کی طرح، لاگ اور لگاؤ سے بالاتر ہو کے، اپنی روح کے من اندر، بے لوث چاہت کی موم بتی جلاتی ہے، تو اس کی آنکھوں میں ہیروں کی پیوند کاری ہونے لگتی ہے۔ فروزاں بتیاں صاف جلتی نظر آ جاتی ہیں۔ ایسی آنکھوں سے بہتر کوئی راہ دکھانے والی روشنی نہیں۔ ایسی آنکھوں کا ساتھ ہو تو راہ گم نہیں ہوتی۔ ایک راہ سے ہزار رستے نکلتے ہیں۔ ہر رستہ کھلا، ہر راہ شاندار، میں نے بچپن میں، جوانی میں اپنی ماں کے ساتھ کئی سفر کیے۔ بڑے رستے کھلے، کھلے رستے ملے۔ مفتی جی کے ساتھ بھی دور دور تک جانا ہوا۔ دور راہوں کی نشاندہی ہوئی۔ اس بار اظہر جاوید کے ساتھ سرحد پار اس شہر جانے کا سندیس ملا، جدھر کی مٹی میری ماں کی روح نے اپنے گرد لپیٹی ہوئی تھی۔ میرے قدم زمین سے ڈھائی انچ اوپر کیوں نہ اٹھتے۔

لدھیانے سے کیول دھیر کا جب بھی فون آتا، دوسرے فقرے کی پہلی بات وہ یہی کہتا۔ ''ابدال، اظہر جاوید کو ساتھ لے کر آنا۔''

''کیوں نہیں، بھاجی، وہ ساتھ ہوں گے''۔

''یار! تیرے پاس سارک ویزہ ہے، بشریٰ رحمان کے پاس بھی یہی ہے۔ بشریٰ اعجاز کو بھی مسئلہ نہیں ہونا۔ فرحت بھی لگوا لے گی۔ یار، دیکھ، اظہر جاوید کو مشکل ہونی ہے۔''

''دیکھ! میں اظہر جاوید کو جانتا ہوں۔ وہ درویش منش ہے۔ بڑا خوددار ہے اس نے کسی کو کہنا نہیں۔ دیکھ! وہ رہ نہ جائے۔ اسے ساتھ لے کر آنا۔

ڈاکٹر کیول دھیر لدھیانے کا ''بادشاہ'' ہے۔ میری ماں کے شہر کا راجہ۔ پتہ نہیں لدھیانے کی مٹی کوئی انوکھی مٹی ہے۔ اس کی کوئی خاص خصوصیت ہے۔ میری ماں بھی اسی طرح کیا کرتی تھیں۔ ویسے تو انہیں زندگی بھر کبھی مجھ سے کوئی ایسا کام نہ پڑا، جس کے لیے انہیں مجھے کچھ کہنا پڑے۔ ایک بار، کہیں ان کی گلی کی کوئی عورت کسی کام سے ان کے پاس آ گئی۔ اس عورت کو اپنے بیٹے کے لیے شاید نوکری چاہیے تھی یا کوئی من پسند پوسٹنگ۔ کچھ ایسا ہی چھوٹا موٹا کام تھا۔ کام بھی میرے شہر میں۔ وہ عورت تھی پیچھے لدھیانے کی۔ کہیں سے اسے میرے بارے میں خبر ملی ہوگی کہ فلاں شہر کے فلاں دفتر میں ہے۔ بس جی امی جی کے پاس پہنچ گئی۔ اب جب کبھی امی جی سے فون پہ بات ہوتی تو دسری بات، کیول دھیر کی طرح یہی کرتیں ''پُتر! میری پڑوسن کے بیٹے کا مسئلہ حل کیا؟ پتر! تیرے شہر سے اسے تیری وجہ سے آس ہے۔ اس کا مان نہ توڑنا۔ اس کا کام کرا دینا۔''

''جی، امی جی۔'' میں فون پہ سر جھکا دیتا۔

کیول دھیر ٹیلیفون پہ کہتا،

''ابدال، تو اسلام آباد میں بیٹھا ہے۔ اظہر جاوید کا ویزہ تو نے خود جا کے سٹیمپ کروانا ہے۔''

''سمجھ گئے نا!''

''جی، بھا جی۔ میری ان سے بات ہوگئی ہے۔ وہ آئیں گے میرے پاس۔'' بات ہوئی بھی تھی کئی بار۔ ایک بار اظہر جاوید کہنے لگا۔ ''یار مینوں نال لے جائیں!''

''سرکار، آپ کے ساتھ جانا ہی تو میرا اعزاز ہے۔'' میں ممیا کے بولا۔ کہنے لگا! یار سچی بات یہ ہے۔ تیرے ساتھ جانے کا سن کے حوصلہ ہوگیا۔ پہلے ہمّت نہیں ہو رہی تھی۔ تو جانتا ہے، بیمار آدمی ہوں۔ لوگوں کو اپنی بیماری کی تفصیل نہیں بتاتا۔ وہ سمجھتے ہیں، خودسری ہے، تو ڈاکٹر ہے، اپنے بیمار کو جانتا ہے۔ بس اب تسلّی ہے''، میں کہتا ''آپ پاسپورٹ بھیجیں۔''

وہ کہتے ''میں خود آؤں گا، پاسپورٹ سمیت۔ دن تو تھوڑے رہ گئے ہیں۔''

''ہاں دن تو تھوڑے ہی ہیں۔''

''اتنے بھی تھوڑے نہیں، آپ حوصلہ کر کے آ جائیں ادھر حوصلہ ہی تو نہیں ہوتا۔''

''کریں نا، حوصلہ۔''

''تو دعا کر دے۔''

''میں تو دعا کروانے والا ہوں۔''

''تیریاں خیراں، میں فون کر کے آ وَں گا۔''

میں ہر فون پہ ان کا انتظار کرنے لگا۔ اس دن سارا دن دفتر میں کچھ عجیب مصروفیت رہی۔ سیل فون میں نے بند کر کے جیب میں ڈالا ہوا تھا۔ شام کو گھر جاتے ہوئے فون آن کر دیا۔

ٹرن ٹرن کر کے، کئی ایس ایم ایس فون میں گرنے کی آواز آئی۔ میں گاڑی چلاتا رہا۔ سوچا گھر جا کے پیغام پڑھوں گا۔ پھر ایک گھنٹی بجی۔

میں نے سٹیرنگ سے ہاتھ اٹھا کے، فون دیکھا۔ کیول دھیر کا نام چمک رہا تھا۔

''جی بھا جی'' مجھے پتہ تھا اب سلام دعا کے بعد انھوں نے دوسری بات اظہر جاوید کی کرنی ہے۔ بڑا حیران ہوا جب انہوں نے پہلی بات ہی اظہر جاوید کی کر دی۔

اظہر جاوید کا نام سنتے ہی میں فوراً بولا۔

''آپ فکر نہ کریں، بھا جی، انہیں لے کر آ وَں گا۔''

''وہ تو چلا گیا!''

''تجھے پتہ نہیں چلا۔''

''ہیں!''

''کس بات کا؟''

میرا دل ایک دم سے ان کے لہجے کی اداسی اور دکھ سن کے ڈوبنے لگا۔ جیسے بھاگتی کشتی کے پیندے کا کوئی پھٹہ کھسک جائے۔ اس میں ایک دم سے سوراخ ہو جائے۔ وہ پانی سے بھرنے لگے اور ڈوبنے لگے۔

''تجھے اظہر جاوید کی خبر نہیں ملی؟''

کیول دھیر کی آواز میں سسکیاں تھیں۔ جیسے روتے روتے بول رہا ہو۔ بولتے بولتے رو رہا ہو۔ میں سہم گیا۔ جیسے اونچے گول جھولے پہ جھولتے ہوئے بندہ ایکا ایکی میں اوپر سے نیچے تہہ میں آ لگے۔ میرا دل کنویں میں گرنے لگا۔

میں مری روڈ پہ گاڑی چلا رہا تھا۔ چاندنی چوک کے فلائی اُوور تعمیر کی وجہ سے ٹریفک نچلی سڑک پہ جام تھی۔ کوئی دو گز گاڑی آگے بڑھتی تو پھر بریک لگانا پڑتی۔ اب کیول دھیر کی فون پہ بات سن کے دل کی دھڑکن رک رک کے چلنے لگی۔ میں سہم گیا۔ کوئی بہت ہی دکھ بھری خبر سننے کے لیے روح کے اندر لرزا طاری ہو گیا۔

گاڑی خود بخود جس رفتا میں رینگ رہی تھی، رینگتی رہی، کیول دھیر کی سسکتی آواز آئی۔

''یار، اظہر جاوید فوت ہو گیا۔''

''ہیں؟''

''میری گاڑی اگلی گاڑی سے ٹکرانے لگی، بریک لگی اور ٹھاہ سے پچھلی گاڑی میری گاڑی کے بمپر سے آ لگی۔''

''ہیں یہ کیا ہوا!''

میں گاڑی روک کے سٹیرنگ پہ سر رکھ کے بیٹھ گیا۔

ٹاں، ٹاں، پیچھے ہارن بجنے لگے۔

میرے اندر کے سارے فیوز اڑ گئے۔

سارا شہر ایمبولینس کی چیخ بن گیا۔

میرا خون برف کی ڈلیاں بن کے رگوں میں جمنے لگا۔

یہ کیا ہوا!

ہیں۔

اظہر جاوید!

میرا یار،

میرا بابا،

درویش بادشاہ،

چلا گیا۔

اس طرح، چپ چاپ، اور شہر اب چیخ رہا ہے۔

اس سے تو ابھی جی بھر کے باتیں بھی نہ ہوئی تھیں۔ اس کے ساتھ تو مجھے لدھیانے جانا تھا۔ کتنی باتیں میں نے سوچی ہوئی تھیں، راہ میں سفر کرتے کرتے یہ پوچھوں گا۔ ابھی پچھلے دنوں میرے اکٹھے چھ ناول سنگِ میل پبلشرز نے چھاپے۔ ان میں ''ماؤ میوال'' نام کے ناول کا انتساب میں نے اظہر جاوید کے نام کیا تھا۔ کچھ دن پہلے میں نے فون پہ انہیں انتساب کی عبارت پڑھ کے سنائی تھی۔

''ماؤ میوال ناول

بھگوان سٹریٹ کے کرشنا

اظہر جاوید

کے نام

جسے ہر صاحباں سوڈی شاہ مانتی ہے۔مگر اس کے ٹالنے سے ٹل جاتی ہے۔''

اظہر جاوید یہ سن کے بہت ہنسا۔ڈھیروں دعائیں دیں۔بولا،صحیح کہتے ہو۔سب صاحبائیں ٹل جاتی ہیں۔میں بریک پہ پاؤں رکھے،ایمبولینس کی طرح چیختے شہر کی شاہراہ پہ گم ہوا سوچ رہا تھا۔

یہ کونسی صاحباں،اظہر جاوید کے سامنے آ گئی۔جو نہ ٹلی۔

اور چلا گیا۔

میں نے تو اسے انتساب والا یہ صفحہ بھی نہیں دکھایا تھا۔ابھی دکھانا تھا۔فون پہ انہوں نے کہا بھی۔ناول بھیج دے۔چھ کے چھ۔میں نے کہا،سرکار،آپ کے دو قدم پہ سنگ میل کا دفتر ہے۔پورا سیٹ منگوالیں۔میں افضال احمد کو فون کر دوں گا۔پھر''ماؤ میووال''ناول پہ آپ کے لیے لکھنے والی بات تو اندر چھپی ہوئی ہے۔باقی ناول میرے ساتھ ہوں گے۔لاہور سے لدھیانے کا سفر ساڑھے تین گھنٹے کا ہے۔تسلی سے باتیں ہوں گی۔مجھے کیا پتہ تھا انہیں اتنی جلدی ہے۔

بیمار تو تھے وہ مجھے پتہ تھا۔

جن دنوں میری ملتان پوسٹنگ تھی۔میں ان کے لیے دوائیاں لے کر آتا۔انہیں میری ماں کی طرح دل کا عارضہ تھا۔دوائیاں بھی کم وبیش وہی تھیں۔امی جی کے جانے کے بعد وہ دوائیاں کبھی لی ہی نہیں چونکہ میں خود ڈاکٹر ہوں۔ہسپتال میں ہی ڈیوٹی ہوا کرتی تھی۔دوائیوں کے میرے پاس ڈھیر لگے تھے۔جب کبھی لاہور جاتا،تو اظہر جاوید کے لیے دوائیوں کا ایک لفافہ لے جاتا۔ادھر جانے میں دیر ہوتی تو لفافہ پوسٹ کر دیتا۔دوائیاں اس کے دفتر پہنچ جاتیں۔ایک بار میں اس کے دفتر گیا۔باتوں باتوں میں اسے بتانے لگا کہ نئی ذمہ داریاں عجیب سی ہیں۔ملتان ڈویژن کی سیشن مونیٹرنگ ٹیم کا انچارج ہوں۔ادھر کے ہسپتال،جیل خانے،لائبریریاں،میونسپل کارپوریشن کے ایڈمنسٹریٹر کو ایک دن فون کر کے بلایا۔کہا آتے ہوئے ملتان شہر کا نقشہ ساتھ لیتے آنا۔اللہ جانے اس نے کیا سوچا ہوگا۔نقشہ آ گیا۔میز پہ بچھ گیا۔وہ ایڈمنسٹریٹر خود بھی دانشور آدمی تھا۔بیرسٹر ظفر اللہ۔اسے خیال آیا،شاید کہیں کوئی پلاٹ الاٹ کرانا ہے۔میں نے اس کی آنکھوں میں اس کا خیال پڑھ کے نفی میں سر ہلایا اور پوچھا۔

''ممتاز مفتی کو جانتے ہو؟''

''بولا،جناب،انہیں بابا مانتا ہوں۔''

''کبھی اس کے لیے کچھ کیا،جسے بابا مانا؟''

''کیا کر سکتا ہوں؟حکم کریں۔''

''میں نے میز پہ پھیلے ہوئے ملتان کے نقشے پہ ہاتھ پھیرا اور کہا،کوئی ایسی سڑک بتاؤ،جس کا ابھی کوئی نام نہ رکھا گیا ہو۔''

''کیوں؟''

''شاید وہ سوچنے لگا ہو کہ سڑک کیسے الاٹ ہو سکتی ہے!'' میں نے کہا ''سڑک کا نام بدلنا ہے۔''

''کیا نام رکھنا ہے؟ اب۔''

''ممتاز مفتی روڈ۔''

اس نے ایک ایک کر کے شہر کی ساری سڑکوں پہ انگلیاں پھیریں۔ پھر کہنے لگا۔ ''یہ ایک بڑی سڑک ہے۔ وہاڑی روڈ۔ ملتان کی حدود میں کم و بیش پندرہ بیس کلومیٹر کے لگ بھگ ہے۔ پرانے وقتوں میں یہ ملتان دہلی روڈ کہلوایا کرتی تھی۔ یہ ہو گئی اب، ممتاز مفتی روڈ۔ ٹھیک ہے؟ ٹھیک۔''

نوٹیفیکشن ٹائپ ہو کے آ گیا۔

اس نے دستخط کر دیے۔

ایک اور عقیدت مند ممتاز مفتی کا ادھر بیٹھا تھا۔ وہ صنعت کار تھا۔ اس نے کئی لوہے کے بورڈ بنوا کے وہاڑی روڈ کے ہر چوک میں لگوا دیے۔ نیا نام ''ممتاز مفتی روڈ۔ نوٹیفکیشن نمبر فلاں فلاں۔'' اسی شہر کے عین قلب میں، بہاؤ الدین زکریاؒ اور شاہ رکن عالمؒ کے درباروں کے درمیان، پرانے قلعے پہ ایک قدیمی لائبریری ہے۔ اس کی بات کی۔ کہ اسے بہتر بناؤ۔

کہنے لگا ''لائبریری کا آدھا حصہ شہر کے ایک بڑے پیرزادے سیاست دان نے قبضے میں لیا ہوا ہے۔ کسی قانون کچہری کو وہ نہیں مانتا۔ سال ہا سال سے آدھی لائبریری کی عمارت اس کے تصرف میں ہے۔''

میں اگلے دن جیپ میں بیٹھ کے ادھر گیا۔

مقبوضہ لائبریری میں بیٹھے بندے بلوائے۔

پوچھا ''ادھر کیوں بیٹھے ہو؟''

''اتنے سال ہو گئے ہیں!''

''یہ تو اور بھی غلط بات ہے، مگر کیوں!''

وہ خاموش

پوچھا ''اگر یہ تم لوگوں کی جگہ ہے تو دکھاؤ کاغذ۔''

وہ خاموش۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ ساتھ کھڑے صوبے وار سے دن پوچھا۔ صوبے دار بولا، سوموار۔

کہا ''سنو۔ جمعرات تک تمہیں مہلت ہے۔ اپنا سامان اٹھا کے لے جاؤ۔ سرکاری لائبریری کے کمرے خالی کر دو۔''

پھر میں نے گردن موڑ کے، صوبے دار کو مخاطب کیا ''صاحب۔ یہ چار کمرے دیکھ لیں، یہ آگے کا دالان۔ یہ باہر کا لان۔ اس دیوار سے لے کر یہاں دروازے تک۔ یہ جمعرات تک خالی ہونا چاہیے۔ جمعرات سہ پر آپ ٹرک لے کر ادھر آ جائیں۔ اگر کوئی سامان یا کوئی بندہ اس جگہ پر نظر آئے تو اسے دھیان سے اٹھا کے سڑک پہ رکھ دیجئے گا۔''

''سمجھ گئے؟''

''جی۔ سمجھ گئے۔''

''کوئی شک۔''

''کوئی نہیں۔''

تھینک یو۔ کہہ کے میں آ گیا۔ جمعرات کی صبح لائبریرین کا فون---- آیا ''خالی کر کے چلے گئے۔ اب لائبریری کو ملے نئے کمروں میں کتابیں پھیلانے لگے ہیں۔ آپ آئیں گے آج!'' میں پہنچ گیا۔

لائبریری کو ملے نئے کمروں کو ریڈنگ روم بنا دی گیا۔ ایک ریڈنگ روم کے باہر تختی لگ گئی، ماہنامہ ''نیرنگ خیال'' روم، دوسرا کمرہ ''ماہنامہ افکار ریڈنگ روم'' تیسرے کمرے پہ تختی تھی ''ماہنامہ تخلیق روم۔'' لائبریری کے بڑے ہال کو ''ممتاز مفتی ہال'' بنا دیا گیا۔ لیڈیز ریڈنگ روم کا نام میں نے دیا۔ ''پروین شاکر روم'' اور ریفرنس کتابوں والے کمرے کے باہر تختی پہ لکھوایا ''قدرت اللہ شہاب روم''۔ سنگ مرمر کی تختیوں پر یہ سارے نام کھد کے آ گئے۔ سیمنٹ کے ساتھ لگ گئے۔

اظہر جاوید کو یہ باتیں، یونہی چائے پیتے پیتے کہہ دیں۔ اظہر جاوید کی آنکھوں کے ستاروں کا چاند بن گیا۔ چاند بھی چودھویں کا۔ بولا کچھ نہیں۔ خاموشی سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے سوچا، شاید میں اول فول بول گیا ہوں۔ شرمندہ ہو کے چپ ہو گیا۔

اگلی بار، جو ''تخلیق'' کا پرچہ ملا تو میں حیران۔ تخلیق کے ایڈیٹوریل ''اپنی بات'' میں اظہر جاوید نے اپنی ایک بات کہی صرف یہ کہ ''آج تک، چالیس سالوں تک میں نے کسی تاجور، کسی بادشاہ، کسی تخت یا کسی تخت نشیں کی مدح نہیں کہی۔ نہیں لکھی۔ آج یہ قسم توڑ رہا ہوں۔'' پورا ایڈیٹوریل اظہر جاوید نے مجھ پہ لکھ دیا۔ میں ہکا بکا رہ گیا۔ سمجھ نہ آئے۔ یہ ہوا کیا۔ اتنی چھوٹی سی معمولی بات۔

اظہر جاوید نے ذرّے کا پہاڑ بنا دیا۔

وہ تو پہاڑوں کو ذرہ ذرہ کرنے میں مشہور ہے۔ یہ اس نے کیا کر دیا۔

میں چونکہ اظہر جاوید کے لیے سر سے پاؤں تک حیرت زدہ احسان مندی میں بھیگا ہوا تھا۔ اس لیے اسی رات کئی صفحوں کا اسے ایک خط لکھا۔ پتہ نہیں عقیدت اور محبت میں اسے اور اس کے رسالے کے لیے کیا کیا لکھ گیا۔ اگلی بار جب رسالہ آیا تو دنیا

جہان کے اس کے نام لکھے خط چھپے تھے،صرف میرا وہ خط نہیں تھا۔

میں نے فون اٹھا کے پوچھا۔

''سرکار! میرا خط ملا تھا؟''

''ملا تھا۔''

میں چپ۔

بولے''تم پوچھنا چاہتے ہو گے کہ چھپا کیوں نہیں''؟

میں سمجھ گیا۔

اس دن مجھے سمجھ آئی۔اظہر جاوید بہت وکھرا آدمی ہے۔یہ آدمی تو اس ساری مدح سرائی اور القابات سے کہیں بلند ہے۔یہ تو اپنے رسالے میں اپنی تعریف نہیں چھپنے دیتا۔

دوسرے ادبی پرچے اٹھا کے دیکھ لیں۔

ٹائٹل پہ مدیر کا نام۔بلکہ مدیر اعلیٰ۔

اندر نام۔

مضامین میں کچھ اپنے لکھے،کچھ اپنے اوپر لکھوائے ہوئے۔کچھ اپنی شاعری،کچھ اپنی شاعری پہ ہوئی شاعری،خطوط بھی وہ چُن چُن کے چھپے ہوتے ہیں جن میں مدیر کے دشمنوں کی ہجو یا مدیر کی واہ واہ۔

یہ کیسا درویش ہے!

اسے اپنا مفاد بھی عزیز نہیں۔

بازار میں بیس روپئے ایک کوکا کولا بوتل کی قیمت ہے۔اور یہ تین مہینوں کی تپسیا کے بعد دو ڈھائی سو صفحوں کا پرچہ چھاپ کے۔ایک ایک کہانی،ایک ایک شعر پڑھ کے،پروف ریڈنگ کر کے،چھپوا کے،بڑے لفافے میں ڈال کے،اوپر ہاتھ سے پتہ لکھ کے،ہونٹوں سے چوم کے خریدے ہوئے ٹکٹ لگا کے بھیجتا ہے۔پھر فون کر کے پوچھتا ہے۔رسالہ ملا؟

یہ کیسی درویشی ہے!

میرا دماغ اسے سوچ کے ہل جاتا۔جب کبھی فون کرتا۔ادھر سے آاں آاں شوں شر کی آواز آتی۔اسی شور سے اظہر جاوید کی آواز کہتی۔

''یار۔رکشے میں ہوں۔آدھے گھنٹے بعد فون کرنا۔''

پتہ نہیں اس کی زندگی میں یہی آدھا گھنٹہ کیوں اتنا طویل ہو گیا۔اس کی زیادہ تر زندگی رکشے اور ٹیکسی میں گزری،پتہ چلا

آخری سفر پہ جاتے ہوئے بھی وہ ٹیکسی میں سوار تھا۔ ذرا طبیعت بگڑی تو ڈاکٹر کے پاس جانے کے لیے ٹیکسی منگوائی۔

ٹیکسی بھلا اتنا تیز دوڑ سکتی ہے!

اس کی زندگی میں بہت گو پیاں اور صاحبائیں آئیں۔ سب اس نے ٹال دیں۔

بس یہ آخری ''صاحباں'' نہ ٹلی۔

ڈاکٹر کے پاس جانے سے پہلے، ٹیکسی میں سوار کی سواری وہیں چھوڑ کے، سوار کو لے گئی۔ ''یار جی! میرے ساتھ تو لدھیانے جانے کا وعدہ تھا؟''

''میری ادھر نہیں چلتی۔''

''آپ نے اپنی چلائی کہاں!''

''بس یار۔''

''ہم کدھر جائیں؟''

جانا اور کدھر ہے، سب ادھر ہی آئیں گے ایک دن۔ اس کے جانے کے بعد میں اس کے دفتر گیا۔ اتفاق سے لوڈ شیڈنگ کا وقفہ تھا۔

دروازہ کھلا تھا، پردہ تنا تھا، اندر اندھیرا، اندھیرا، اس کی کرسی پہ ذرا سی روشنی کا ھیولہ تھا۔ دیکھا میز پہ پڑی ایک چھوٹی سی ایمرجنسی لائٹ جل رہی ہے۔ شاید، ایمرجنسی لائٹ کا بہانہ ہو۔ اس کی روح چمک رہی ہو۔ غم سے میرا دل کٹ گیا۔ بسم اللہ کہہ کے آنکھوں میں تاروں کی کہکشاں کی جوت جگانے والا چلا گیا۔

یہاں تو کوئی بھی نہیں۔ میں نے سوچا۔

اندھیرے میں پڑے ایک صوفے سے ایک لڑکی اٹھی۔

سر! ''ویل کم۔''

''میں کھڑے کھڑے، اکھڑے اکھڑے سانسوں سے وہ کمرہ دیکھتا رہا۔ پھر اس لڑکی کو کیول دھیر کی کتابوں کا ایک بنڈل دے کر کہا۔ یہ کتابیں لینے اظہر جاوید نے خود جانا تھا۔ نہیں جا سکے۔ کیول دھیر نے ان کا حصہ میرے ہاتھ میں دے دیا، کہ پہنچا دو۔ پہنچانے آیا ہوں۔

کچھ دیر میں خاموش سر جھکائے بیٹھا رہا۔

اظہر جاوید کے لیے مغفرت کی دعا کی۔

دعا مانگ کے منہ پر ہاتھ پھیرے ہوئے، اللہ کی طرف کانی آنکھ سے دیکھ کے دل ہی دل میں کہا، اگر اسے درویش

بندے کو بھی جنت نہیں دینی تو پھر کسے دے گا؟

ایسا درویش۔صورت سے بھی، سیرت میں بھی۔ لمبے ریشمی بال، مسکراتا محبتی چہرہ۔ ہیرے کی کنی والی چمکتی آنکھیں۔ سب پیادیکھن کی آس بن گئیں۔اعلیٰ پائے کا شاعر تھا۔مگر شاعروں جیسا بیوپار کرنا نہ آیا۔انشاء پرواز تھا۔مگر اس سے شاہ کا قصیدہ نہ لکھ گیا۔ایڈیٹر تھا آدھ صدی تک اپنی ٹیم نہ بنا سکا، عجیب کپتان تھا۔42 سال اس نے ''تخلیق'' کی آبیاری کی۔

اک بے نیاز مالی کی طرح باغیچہ سنورا۔

کسی پیڑ پودے میں اپنی ذات کی پیوند کاری نہیں کی۔

اپنی پہچان کی نرسری نہیں تیار کی۔

ہر رنگ، ہر خوشبو، ہر ذائقے کے پھل پھول اگائے۔

گلاب کیاریوں میں چھتر تھور تک پرے نہ کیا۔

ہر بوٹے کو پانی دیا۔

بوٹے کی ہر شاخ اور پتے کا منہ دھویا۔

پودے تناور ہو گئے، تو ان کے پھل پھول سے دور جا کے بیٹھ گیا۔ان کا سایہ تک اپنے نصیبوں کی دھوپ کم کرنے کے لیے استعمال نہ کیا۔بس پالے ہوئے جواں درخت کو دور بیٹھ کے دیکھتا رہتا۔مسکراتا رہتا۔

دعائیں دیتا رہتا۔

ایسا بے نیاز مالی ہوا ہے کہیں؟

آخری سفر پہ جاتے سمے بھی کسی کو تردد نہ کرنے دیا۔

کسی سے تیمارداری نہیں کروائی۔

دوپہر تک دفتر تخلیق میں رسالے کا کام کیا۔

سینے میں درد بڑھ گیا تو ٹیکسی منگوا کے ڈاکٹر کی طرف نکلا۔

شاید، راہ میں اسے خیال آیا ہو، ڈاکٹر کو بھی کیا تکلیف دینی ہے!

ممکن ہے، اس نے بول دیا ہو۔

میں تیار ہوں، اللہ جی۔

بسم اللہ۔

اظہر جاوید جیسے بڑے لوگوں کے جانے کے بعد خیال آتا ہے۔سمجھ آتی ہے، لوگ بندے کا بھگوان کیسے بنا لیتے ہیں۔

ایک دن میں نے اظہر جاوید سے کہا۔

''سرکار! میں نے آپ کی گلی کا نام بدلوانا ہے۔''

''اظہر جاوید سٹریٹ'' نام کا ٹوٹیفکیشن نکلوا کے لاتا ہوں۔''

تڑپ کے بولا ''دیکھ ایسا نہ کرنا۔''

''کیوں؟''

''دیکھ یہ ملتان دہلی روڈ یا وہاڑی روڈ نہیں ہے۔''

''پھر''

''اس کا نام جانتے ہو! بھگوان سٹریٹ ہے۔''

''بھگوان سے بدل کے انہوں نے رحمان سٹریٹ کیا ہوا ہے۔''

''پھر!''

''تو میری مان، بھگوان اور رحمان کی گزرگاہ میں میری پلیتی کو نہ لا۔ انہیں نہ چھیڑ۔''

میں ٹھنڈا ہو کے بیٹھ گیا۔

ایک بار میں نے ضد کی۔ ''بابا جی۔ آپ پچاس سال کی ''اپنی بات'' کو جمع کر کے، کتابی شکل میں لائیں۔''

''خریدے گا کون؟''

میں اعلان کرتا ہوں، پہلا پورا ایڈیشن میرا ہوا۔ چل ایک ایڈیشن ہو گیا، اب دوسرے کو بیچ کے کیا کرنا۔ میں پھر لاجواب ہو گیا۔

سمجھ نہ آئی یہ بابا کیا چیز ہے۔

بے نام سے لوگوں کو چھاپ کے ان کی واہ واہ کروا دیتا ہے۔ پھر خود بھی اس کے عقیدت مندوں کا سوانگ رچا کے اس کو رجھانے لگتا ہے، کئی کم ظرف ایسے بھی دیکھے جو اسی پارس سے چھوئے جانے کے بعد سونا بن کے، اسی میں کھوٹ نکالنے کی سوچ پال لیتے۔

کبھی کبھی میں کہہ دیتا۔ ''سرکار! اتنے دیالو بھی نہ ہوا کریں۔''

''کتنے تک کی اجازت ہے؟'' وہ مسکرا کر پوچھنے لگتا۔

سمجھ ہی نہ آئی، یہ بابا کس مٹی کا بنا ہے۔

بندہ بندہ ہوتا ہے، خدا تھوڑی ہوتا ہے کہ اپنے بارے میں سوچے ہی نا۔ بھئی اپنے لیے بھی کچھ سوچو۔ اپنے لیے بھی کوئی

نعمت، کوئی سہولت، کوئی ایوارڈ، کوئی تمغہ، اس نے کبھی بھی اپنے لیے کچھ نہ سوچا۔

اکیڈمی آف لیٹرز (اکادمی ادبیات) میں ڈائریکٹر جنرل ہونے کے دنوں میں، یوں تو میں نے اچھے برے بہتیروں کاغذوں پہ دستخط کیے، ایک کاغذ یاد رہ گیا۔ وہ یادگار کاغذ تھا۔ وہ کاغذ تھا۔ اظہر جاوید کے لیے صدارتی تمغہ برائے حسنِ کارکردگی کے لیے میری لکھی ہوئی سائٹیشن۔ اس پہ دستخط کرنے کے بعد دل مچلنے لگا کہ فون کر کے اظہر جاوید کو بتاؤں۔ فخر زمان اکادمی کے چیئرمین تھے۔ وہ شیشہ دل آدمی، دل بولی سے آشنا ہے۔ اس نے پتہ نہیں کیسے میری سوچ پڑھ لی۔ کہا ''دیکھ سرکاری معاملات ہیں۔ جب تک ایوان صدر سے اعلان نہ ہو جائے اظہر جاوید کو نہ بتانا'' اور کسی کا فخر زمان نے نام نہ لیا۔ ورنہ کرنے کو میں نے اور بہتیروں کے لیے دستخط کیے تھے۔ وہ جانتا تھا کہ اور لوگوں سے مجھے کیا واسطہ۔ جب، جس کو بتانا تھا اسی سے منع کر دیا گیا تو خاموش ہو گیا۔ جس دن اظہر جاوید کے لیے حتمی اپروول کے دستخط ہو گئے تو اس دن بھی میں متعلقہ وزارت میں بیٹھا تھا، پھر بھی خاموش رہا۔ اگلے دن خبر اخبار میں چھپ گئی۔ اب بتانے کا کیا فائدہ تھا۔ اب یہ خبر تھوڑی تھی۔ اب تو واقعہ تھا جس سے سب آگاہ تھے۔

بس اظہر جاوید کو ابھی ایوارڈ لینا تھا۔

مل تو گیا، سینے پہ اسے سجانا باقی رہ گیا۔

23 مارچ کو ایوارڈ ملنا تھا۔ 3 مارچ کو لدھیانے کی دعوت تھی پندرہ دن پہلے اسے اوپر سے بلاوا آ گیا۔

آخری بار فون پہ بات ہوئی تو بولے۔

یار۔ لدھیانے سے واپس کب آنا ہے؟

کوئی جلدی ہے؟

''نہیں پھر ادھر بھی پہنچنا ہے نا؟''

''تیرے شہر، 23 مارچ کو۔ ایوارڈ لینے۔''

''ہاں، ہوا تو آ جاؤں گا۔''

''کیوں کہیں اور بھی جانا ہے؟''

''کوئی اور لے جانے والی ہستی آ گئی تو؟''

''ہاں جی، کرشن مہاراج کی گوپیوں کو کون منع کر سکتا ہے!''

''تجھے سب سے بڑی گوپی کا پتہ ہے؟''

میں ذہن میں کئی نام سوچتے سوچتے چپ ہوا تو فون کے دوسری طرف سے آواز آئی ''یہ ساریاں تو چھوڑنے والی گوپیاں ہیں، لیجانے والی گوپی صرف ایک ہوتی ہے! اچھا جی۔''

میں نے ان کی سنجیدہ بات، ہنسی میں اڑا دی۔

وہ آئی اور اظہر جاوید کو لے گئی۔

ٹیکسی چلانے والے ڈرائیور تک کو آہٹ نہ ہوئی کہ اس کی ٹیکسی میں ڈاکہ پڑ گیا ہے۔ اس کی سواری، کا سوار، اپنی سواری سے اتر گیا ہے۔ اتار لیا گیا ہے۔

اظہر جاوید کے چاہنے والے پریشان کیوں نہ ہوتے۔

پریشان خٹک سے ایک بار سردار عبدالقیوم خان سابق صدر اور وزیر اعظم آزاد کشمیر کے گھر ملاقات ہوئی۔ ادب کی بات ہوتے ہوتے ادبی پرچوں کی بات ہونے لگی۔

کہنے لگے ''جن دنوں شفیق الرحمان اکادمی ادبیات کے چیرمین تھے، میں ان کا ڈائریکٹر جنرل تھا۔ ایک دن شفیق الرحمان کہنے لگے۔ ادبی پرچے آندھی میں چراغ جلائے بیٹھے ہیں۔ ان کی کچھ مدد کرنی چاہیے۔ یوں ہم نے ملک کے ہر اہم ادبی پرچے کے لیے ایک معقول رقم کا بنک ڈرافٹ بنوایا اور بھیج دیا۔ ہر طرف سے ہمیں واہ واہ کے فرشی سلام بھرے خطوط ملے۔ ایک دو سطری خط ملا، ساتھ ہمارا بھیجا ہوا ڈرافٹ ملفوف۔ حیرانی سے خط پڑھا، لکھا تھا۔

''آپ کی توجہ کا شکریہ۔ ابھی اس عاجز کے کندھوں میں اپنے پرچے کا بوجھ اٹھانے کی سکت ہے، اظہر جاوید۔''

''پریشان خٹک کہنے لگے، میں اور شفیق الرحمان حیران۔ یار، یہ کیسا بندہ ہے۔ ہمیں سمجھ نہ آئی، بولے اب سمجھ آئی ہے، بہت بڑا آدمی ہے، کیسا ہے؟''

میں نے کہا، ''سرکار! ویسا ہی ہے۔''

اکادمی ادبیات میں مارچ2010ء عالمی ادبی کانفرنس برائے صوفی ازم کے موقعے پہ اٹھاسی ممالک سے مندوبین اسلام آباد پہنچے ہوئے تھے۔ سب اسلام آباد ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ اسی ہوٹل میں کچھ گنے چنے پاکستانی ادیب بھی ٹھہرا لیے۔ اظہر جاوید انہی میں سے ایک تھا۔ کانفرنس سے ایک شام پہلے میں، کانفرنس کی تیاریوں میں الجھا ان کے پاس گیا تو بولے۔

''یار۔ ایک کام کرنا۔''

''حکم۔''

''میں بیمار آدمی ہوں۔ میرے ساتھ غیر ملکیوں والا سلوک کرنا۔''

کیا مطلب؟

''تم نے غیر ملکیوں کو سنگل کمرہ دیا ہے، پاکستانی ایک کمرے میں دو ٹھہرائے ہیں۔''

''جی۔''

''مجھے بار بار واش روم جانا پڑتا ہے۔ مجھے کمرہ اکیلے کو دینا۔''

''ڈن۔''

اس وقت ہوٹل میں ڈنر سرو ہو رہا تھا۔ ڈنر میں کہیں کراچی سے آئے میرے بڑے بھائی افضال بیلا ان کے ساتھ جا بیٹھے۔ وہ شاعر ہیں، اسی ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ ڈنر کے بعد پلٹنے لگا تو اظہر جاوید نے مجھے پھر بلایا۔

بولے، ''یار۔ اکیلا کمرے میں کیا کروں گا۔ تم افضال بیلا کو میرے کمرے میں کر دو۔''

کانفرنس کے دنوں میں رات کو فارغ ہو کے انہی کے کمرے میں جا بیٹھتا۔ بڑے بھائی بھی ادھر تھے۔ خوب باتیں ہوتیں۔

ادب کی، ادب والوں کی، پھر بھی بڑے بھائی کی موجودگی میں کئی پوچھنے والی باتیں، پوچھنی رہ گئیں، کئی بتانے والی باتیں، بتائیں نہ گئیں، سوچا تھا، لاہور سے لدھیانے اور لدھیانے سے دہلی کے سفر میں وہ ساری باتیں کریں گے۔

اللہ جانے، اللہ قسمت میں سفر کس طرح لکھتا ہے!

نصیب میں لکھے سفر تو رہنے دیتا ہے۔ ہم سفر بدل دیتا ہے۔

لدھیانے پہنچ کے، میں کیول دھیر کی کھلی بانہوں میں سر دے کے رو پڑا۔ بھا جی، کہنے کو کچھ کہا تو نہیں، دل کہہ رہا تھا بھا جی۔ میں بے بس آدمی ہوں بغیر سوچے سمجھے وعدہ کر لیتا ہوں۔ اظہر جاوید کو ساتھ لانے کا وعدہ کیا تھا۔ پورا نہ ہو سکا۔

کیول دھیر بھی لدھیانے کی سوہنی مٹی سے بنا ہے۔ اس کے چہرے پہ بھی میری ماں کی آنکھیں ہیں۔ اس کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ وہ آنسو پونچھتے ہوئے میرے کندھے تھپتھپا کے زیر لب بولا۔ ''یار جس کے لیے ہم ادھر کا ویزہ لگوانے کے جتن کرتے رہے اس نے آناً فاناً وہ ویزہ لگوا لیا کہ ساری کائنات اس کی اُڑان میں آ گئی۔ اس کی روح تیرے آنے سے پہلے کی یہاں پہنچی ہوئی ہے۔ تو اوپر اسٹیج پہ چڑھ کے اسے دیکھ، سُن۔''

اظہر جاوید تو مجھے نظر نہیں آیا۔ اُس کی آنکھیں ہر محبت سے تکتے چہرے پہ نظر آنے لگیں۔ ان سب کی آنکھوں میں میری ماں کی دیکھن والی آنکھ تھی۔

ایسی تاروں کی جوگ میں جیتی آنکھوں کو موت نہیں آتی۔ یونہی تو نہیں، بابا فرید نے کہہ دیا تھا۔

کاگا سب تن کھائیو، چُن چُن کھائیو ماس
اک نیناں مت کھائیو، پیا دیکھن کی آس

◆◆◆

مدھوبن کا گِردھر.....اظہر جاوید!

بابا محمد یحییٰ خان (امریکہ)

اوائل عمری میں مجھے بڑے پیر صاحب حضرت جماعت علی شاہ رحمتہ اللہ علیہ کے جنازے میں شمولیت کا موقع نصیب ہوا تھا، لیکن اس میں محبت وعقیدت سے زیادہ میری ضرورت اور عادت کا تعلق تھا۔ میں کسی بے خبرے کی جیب صاف کرنا چاہتا تھا۔ اچانک سامنے پیر صاحب کے جنازے کو کندھا دیے، ایک سوٹڈ بوٹڈ بابو، جس کے کوٹ کی سامنے والی جیب میں ایک چمکتا ہوا پارکر پین، مجھے دعوتِ دسترس دیتا ہوا دکھائی دیا۔ میں ایک میکینکی انداز میں کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے اس کے ساتھ جڑ گیا۔ چند قدم آگے پہنچ کر میں الگ ہوا تو وہ پین میرے نیفے میں اڑسا ہوا تھا۔ اس وقت زمانہ کے حساب سے اس ''پارکر پین'' کو پار کرنا میرے لئے ایک قابلِ فخر کارنامہ تھا کیونکہ یہ پین ہر دور میں بڑے قیمتی رہے ہیں۔ ثواب کی بجائے عذاب لے لیا تھا۔ ایک ولی اللہ کے جنازہ میں شریک کسی عقیدت مند کی جیب پہ ہاتھ ڈالنا بڑی قبیح حرکت تھی، پَر جو ہونا لکھا تھا وہ ہو چکا تھا.....اس کا بھگتان، آج تک بھگت رہا ہوں کہ قلم ہاتھ سے چمٹ کر رہ گیا ہے۔

کچھ روز بعد میں پین فروخت کرنے کی غرض سے لاہور آ گیا۔ انارکلی میں کچھ دکانداروں کو دکھایا۔ ان کے روّیہ سے یوں لگا جیسے میں نے قلم نہیں سانپ پکڑ رکھا ہو۔ فضول سے سوالات، شک بھری نظریں، پولیس کی دھمکی.....تو کسی نے دیکھتے ہی انکار میں سر ہلا دیا۔ کسی نے کوڑیوں میں دام لگائے۔ تب میں نے بیچنے پر لعنت بھیجتے ہوئے اسے اپنے پاس رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔

اب اس صورت اسی سے دو کام ہی لیے جا سکتے تھے۔ شلوار میں ازار بند ڈالنے کا یا کچھ لکھنے لکھانے کا..... مجھے لکھنا اچھا لگا۔'' رومی، سعدی شیرازی، اقبال، حالی، ظفر علی خان، نیاز فتح پوری، انیس، دبیر کی نظمیں، غزلیں، مرثیے، اقوالِ زریں نقل کرتا رہا۔ اسی قلم سے میں نے خوش نویسی بھی سیکھی۔ ذرا آگے حوصلہ کھلا تو ایک کہانی بھی لکھ ماری۔ یہ میری پہلی تخلیق تھی جو موتیوں کی طرح سجا بنا کر میں نے ایم اسلم کی خدمت میں پیش کی۔ اُنہوں نے کہانی کی بجائے، خوش خطی اور اُسلوب کی تعریف کرتے ہوئے کہانی کی بُنت پہ محنت کا کہہ کر مجھے ٹرخا دیا۔

اس قلم کا اعجاز کہ مَیں نے خوش نویسی سیکھ لی، کہانی کہنا آ گیا اور شاید بد دعا بھی تھی کہ مجھے کسی کے جنازے اور تعزیتی

تقریب میں شمولیت کا موقع نہیں ملتا تھا، چاہنے اور کوشش کے باوجود محروم رہ جاتا۔ اس قلم کے واقعے سے برسوں پہلے کے جنازے بھی اس میں شامل ہیں۔'' اپنے مرشد اقبالؒ کا جب مزید اقبال بلند ہوا تو میں، سیالکوٹ آبائی گھر کے پالنے میں پڑا بڑے مزے سے دائیں پاؤں کا انگوٹھا چوس رہا تھا یعنی میرے لئے دودھ کے سوتے، میّا گیا یا ہاتھ کے انگوٹھے میں نہیں، پاؤں کے انگوٹھے میں پھوٹے تھے کہ اسی انگوٹھے سے وقتِ آخر، زندگی کی تانت کھینچی جاتی ہے۔ آگے جا کر حافظ باؤ ٹرین، بابا جی سنگلاں والے، چاچی جمو والی، ٹٹو سائیں، سرکار ذہین شاہ، حکیم خادم علی، ظفر علی خان، شورش کاشمیری، اللہ اُن کی قبروں کو عنبرین فرمائے، مَیں ان اپنے بابوں کے وقتِ آخر پہ قریب قریب کہیں موجود نہ تھا۔

بابا قدرت اللہ شہاب کا انتقال ہوا تو میں تل ابیب میں پھنسا پڑا تھا۔ مفتی صاحب کے موقع پہ میں مراکش میں تھا۔ بابا جی اشفاق کے ارتحال پہ انگلستان میں تھا۔ دوسرے روز پہنچا تو بھائی لوگ گٹھلیاں پڑھ رہے تھے۔ ماں جی بانو قدسیہ نے میری کلائی پہ گرفت کرتے ہوئے وعدہ لیا کہ مجھ سے پہلے تم یہ خاں صاحب والی حرکت نہیں کرو گے۔ مجھ سے ہاں کروا کر ہی میری کلائی چھوڑی۔ صبح سے شام تک ایک سو ایک بار بلاوے آتے ہیں۔ طرح دے جاتا ہوں.....تا کے؟ مجھ سے وعدہ لینے والی، پی ٹی وی پہ کہتی ہیں۔ خان صاحب کے بعد بکھر کر رہ گئی ہوں، یقین کریں! اُن کے بغیر زندگی، شرمندگی سی لگتی ہے۔''

اُن کے ایک خاں صاحب کے جانے سے وہ بکھر کے رہ گئی ہیں۔ میرے تو کارواں کے کارواں لد گئے۔ میرا کیا ہو گا؟ مجھ سے جینے کا وعدہ لے کر اُنہیں کیا ملا؟

کبھی وہ دو ٹانگوں پہ چلتی تھیں، اب ایک تیسری ٹانگ بھی اُن کے ہاتھ میں دکھائی دیتی ہے اور اس میٹل کی چھڑی کے نیچے چار ٹانگیں اور بھی ہیں۔ دائیں بائیں، دو دو ٹانگوں والے اس پہ مستزاد.....

ع یہ بھی کوئی جینے میں جینا ہے

بھگوان سٹریٹ کے کرشن کنھیا نے دائمی بن باس لے لیا.....اس کی رخصتی پہ بھی مَیں اِدھر موجود نہ ہُوا اور نہ دیر بدیر کسی تعزیتی مجلس میں شامل ہو سکا۔ مَیں اُس کی رگِ جاں کے قریب نہ سہی لیکن اس کی کوئے جاناں کا اک غریب فقیر ضرور تھا۔ لاہور میں، مَیں اگر کسی ادبی بیٹھک میں اکثر بیٹھا تو وہ تخلیق کا دفتر تھا۔ عصر کے بعد چیدہ چیدہ ادیبوں، شاعروں سے ملاقاتیں، اسی کے توسط سے ہوئیں۔ اُس کا بات بات، سانس سانس یا اللہ، کہنا، از حد دل کو چھوتا تھا۔ بیٹھنے کو کہاں نہ بیٹھا؟ خواجہ حسن نظامی، حاجی لق لق، خوشتر گرامی، دیوان سنگھ مفتوں، یوسف دہلوی، نگار کا دفتر، افکار کا دفتر، شہاب، چٹان، شمع، ڈائریکٹر، فلم ساز، آدابِ عرض، نمک دان، نقوش، ساقی، ادبِ لطیف، نقّاد، معاصر.....مگر یا اللہ مدد کا نعرۂ مستانہ یہیں تخلیق کے صنم کدہ میں بلند ہوتا تھا۔ وہ بھی پورے جذب وصدق کے ساتھ۔'' مجھے یقین ہے کہ رضا، فنا اور بقا کے تمام منزلیں اس پہ تمام ہو گئیں اور وہ اطمینان سے عالمِ برزخ میں بیٹھا، تخلیقِ کائنات، تخلیقِ بشر اور بھگوان سٹریٹ والے مجلّہ ''تخلیق'' کے بارے اپنی نامکمل تھیسس مکمل کرنے میں جُتا ہو گا؟

ماتا جی نے نہ جانے کس ترنگ میں اسے بھگوان سٹریٹ کا کرشن کنھیا کہہ دیا تھا۔ گوتم، بھگت کبیر، نانک، سدھارتھ یا کالی داس نہ کہا کہ ان مہامنشوں میں کسی نے بھی کہیں نفیس تراش خراش کا قیمتی سوٹ یا من بھاؤنے سندر پیراہن نہ پہنے ہوں گے۔ لیکن ماکھن چور من موہنے کرشن نے جو بھی پہنا، الگ سا پہنا۔ اُن کے چمپا سر یر پہ پھبتا بھی خوب تھا۔ مگھٹ، بالے، چندن جھالے، جوشن، بھوشن، لہراتی جُھٹائیں اور مدھ بھرے کٹیلے نین، بھید بھری باتیں، پریم کی گھاتیں، یعنی دو جے اوتاروں سے چھب ڈھب ہی نرالی..... گائیوں گوپیوں میں مَن خوب لگتا تھا۔ مُرلی مست کر دینے والی بجاتے تھے۔ پریم ترانے خوب گاتے تھے۔ شاید ایسی ہی خوبیاں خرابیاں دیکھ کر ماتا جی نے انہیں بھگوان سٹریٹ کا کرشن کنھیا کہا تھا۔

''اظہر جاوید بھی نئے پرانے ملنے والوں سے اس کا ذکر کرتے تھے۔ کیوں نہ کرتے وہ ادب وشعر کے مدھوبن کے گردھر ہی تو تھے۔ اظہر بھی اور جاوید بھی.....''

علمی ادبی گوپوں اور گوپیوں میں گھرے رہنا اُنہیں بہت پسند تھا۔ وہ انتہا کے فقرے باز، بذلہ سنج اور حاضر جواب تھے۔ کسی کی دل آزاری مقصود نہ ہوتی بلکہ گفتگو کے درمیان دَر آنے والی بوسیدگی ختم کرنا مقصد ہوتا۔'' اُن کی چہلیں اور چہچہے اس وقت دیکھنے سننے والے ہوتے جب اُن کا یارِ دیرینہ ڈاکٹر کنول فیروز موجود ہوتا۔ مَیں بہت پہلے سے ان آدھے مسلمان اور آدھے مسیحی دوستوں کو اپنا اُستاد تسلیم کر چکا ہوں۔ ان دونوں علم وادب، زبان و بیان کے استادوں نے میری فضول سی کتابوں کی زبان اور نام نہاد درویشی کے خدوخال سے چُن چُن کر تنکے اور روڑے نکالے کہ جس طرح کام کاج سے فارغ ہو کر مائیں، اپنے بچوں کے سر، گوڈوں میں کس کر جوئیں لیکھیں نکالتے ہوئے یہ نہیں سوچتیں کہ زندہ جسموں پہ سر بھی اُگے ہوتے ہیں۔ سر ہوں گے تو جوئیں اور لیکھیں بھی ہوں گی..... تاج اور تلواریں بھی ہوں گی۔ سجدے بھی ہوں گے اور جبینیں بھی ہوں گی۔''

حسبِ حال واعمال، میں اپنے اس نابغۂ روزگار اُستاد کی کسی تعزیتی مجلس میں شامل نہ ہو سکا۔ سچ تو یہ ایسی تقریبات میں شمولیت کا حوصلہ مجھ میں موجود ہی نہیں۔ اظہر، اظہر من الشّمس اور زندہ جاوید تھا اور رہے گا بس! تبدیلی لباس یا ہوا خوری کے لئے ذرا کی ذرا اِدھر اُدھر نکل گیا ہے۔ روانگی سے چند روز پیشتر، مَیں اپنی ایک کتاب لے کر اُس کے ہاں حاضر ہوا۔ حسبِ معمول بہت سی باتیں ہوئیں۔ چائے پی، ڈاکٹر کنول فیروز بھی آ گئے..... اگلے روز اُن کا خوبصورت خط موصول ہوا!

''محبی یحییٰ!

یوں تو آپ کی نوازشوں اور کرم نوازیوں کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ بس! یونہی خیال آیا آپ کو سپاس کا ایک خط لکھ دوں۔ خدا آپ کو شاد آباد رکھے۔ ربّ راکھا۔''

اس طرح میرا استاد مجھے ربّ کے حوالے کر کے، خود بھی اُس کے پاس چلا گیا۔ سوچ رہا ہوں اس شہرِ ادب وسخن کے ہنر وراب کس کرشن کنھیا کے ہاں جایا کریں گے۔ ڈاکٹر کنول فیروز کیسے جی پائے گا؟ تخلیق کا کیا ہوگا؟ وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا؟

◆◆◆

دیکھو ہم نے کیسے بسر کی اس آباد خرابے میں

مظفر حسن منصور

سرگودھا کے اہلِ قلم نے پچاس کی دہائی میں والدِ گرامی جناب جوہر نظامی کی سلور جوبلی کا اہتمام کیا تو ہفت روزہ ''شعلہ'' کے مدیر میر عبدالرشید اشک نے اس سلور جوبلی کے حوالے سے ''جوہر نظامی نمبر'' شائع کیا، جس کی بدولت جوہر نظامی کی شاعری کا خوب چرچا ہوا اور نوجوان شعرا والدِ گرامی کی طرف تلمّذ کے لیے رجوع کرنے لگے۔ الطاف مشہدی سرگودھا کے شعراء میں بلند مقام رکھتے تھے۔ عام شاعروں کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور سرگودھا میں صرف جوہر نظامی ہی کو شاعر گردانتے تھے۔ الطاف مشہدی اک گونہ بے خودی کی عملی تصویر تھے۔ شغلِ مے کشی کی وجہ سے شاگردوں کے کلام کی اصلاح اور مشورے کا ان کے پاس وقت نہ تھا، چنانچہ وہ اپنے شاگردوں کو جوہر نظامی کے پاس شاعری کی تربیت کے لئے جانے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ رشک انقلابی جو بعد میں رشک ترابی کہلائے پہلے الطاف مشہدی کے شاگرد تھے اس طرح ہی جوہر نظامی کے حلقۂ تلمّذ میں آ گئے۔

مذکورہ سلور جوبلی کے بعد جو نوجوان سب سے پہلے جوہر نظامی کے شاگرد ہوئے، وہ اظہر جاوید تھے۔ میر عبدّ الرشید اشک کے توسّط سے ماہنامہ ''کامران'' کے دفتر میں ان کی پہلی ملاقات جوہر نظامی صاحب کے ساتھ ہوئی۔ پھر ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا گیا، جو بالعموم دین ہوٹل سرگودھا میں ہوتی تھیں۔ اظہر جاوید بھاگٹانوالہ سے سرگودھا آتے اور دین ہوٹل میں قیام کرتے۔ اس ہوٹل میں ان کا کمرہ مخصوص تھا، ہمیشہ اسی میں رہتے جو بیرا ان کی خدمت پر مامور تھا اس کا نام سمندر خان تھا۔ اظہر جاوید کے آنے سے ہوٹل کی رونق دوبالا ہو جاتی۔ دوست احباب ملنے چلے آتے اور سمندر خان ان کے احکام کی تعمیل میں سرگرم ہو جاتا۔ اسی ہوٹل میں جناب جوہر نظامی نے ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کو نکھارنے کا آغاز کیا اور رفتہ رفتہ انہیں شعر و شاعری کے اسرار و رموز سے آشنا کیا۔ استاد اور شاگرد کے درمیان ذاتی مراسم کی بنا پر راز و نیاز کی باتیں بھی ہوتی ہوں گی اور آپس میں محبت کا درد بانٹنے کا سلسلہ بھی رہتا ہوگا، جس کے گواہ اکیلے اظہر جاوید تھے، جواب ہمارے درمیان نہیں رہے۔

والدِ گرامی کے ایک جگری دوست آغا محمد سلیم خان تھے، وہ ایک ریٹائرڈ پولیس افسر تھے اور کبھی اچھرہ لاہور میں مقیم

تھے۔ایک دن والد صاحب نے ان سے اظہر جاوید کا تعارف کروایا اور کہا کہ یہ نوجوان شاعر بھی ہے اور ایک اخبار بھی نکالتا ہے جس کا نام ''ضربِ مجاہد'' ہے۔اظہر نے اپنا اخبار انہیں پیش کیا۔خان صاحب نے اخبار کی پیشانی پر اقبالؔ کا یہ شعر پڑھا۔

''دلِ بیدار پیدا کر کہ یہ دل مردہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری''

کہنے لگے عزیز اظہر یہ کیسی ضربِ مجاہد ہے کہ ''نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری'' اخبار کی پیشانی کے لئے کوئی مناسب شعر تو چنا ہوتا''۔سب ہنسنے لگے۔خود اظہر جاوید بھی لطف اندوز ہوئے۔ ہفت روزہ ''ضربِ مجاہد'' صحافت میں ان کا پہلا قدم تھا۔وہ ایک مدّت تک اس اخبار کو نہایت کامیابی سے نکالتے رہے۔

ان کا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ تھا۔شاعری کی طرف رغبت کا باعث بھی اس کا یہ طبعی میلان تھا۔مُحبّت اس کی پہچان تھی۔ بیوی کے ساتھ محبت ایک معاشرتی فریضہ ہے انھوں نے اس فرض کو بھی نبھایا اور اپنے بچوں کی تربیت و پرورش میں بھی کوئی کمی نہ آنے دی۔ وہ اپنی جوانی میں محبت کے سحر سے تاعمر نہ نکل سکے۔اس محبت کی آنچ وہ آخر دم تک اپنے اندر محسوس کرتے رہے۔ یہ جذبہ ان کی تخلیقی سرگرمیوں کو برقرار رکھنے کا ایک کارآمد ذریعہ ثابت ہوا۔سچا فنکار اپنے معصوم جذبوں کا نہ صرف تحفّظ کرتا ہے بلکہ اس کی آبیاری بھی کرتا رہتا ہے جس کے نتیجے میں عمدہ تخلیقی شہ پارے معرضِ وجود میں آتے ہیں۔اظہر جاوید ایک سچّا فنکار تھا۔اس نے کسی کے ساتھ دھوکہ نہیں کیا اس نے اپنے معصوم جذبوں کی پرورش کرتے ہوئے ''تخلیق'' کے اشاعتی عمل کو تاحیات جاری وساری رکھا۔

اظہر جاوید مجھ سے چار سال بڑے تھے لیکن انھوں نے مجھے ہمیشہ ایک چھوٹے بھائی اور دوست کا درجہ دیا۔میں جب بھی ان سے ملنے ''تخلیق'' کے دفتر میں حاضر ہوتا،نہایت خندہ پیشانی سے ملتے۔''پیارے'' کہہ کر مخاطب کرتے۔اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر دیتے۔ والد گرامی جناب جوہر نظامی مرحوم کو آخر دم تک اپنا استاد ہی کہا۔ان کی وجہ سے بھی باہمی محبت اور احترام کا رشتہ ہمارے درمیان موجود تھا۔ایک مرتبہ ''تخلیق'' کے دفتر میں ملنے کیلئے حاضر ہوا تو جناب قتیل شفائی ان کے سامنے تشریف فرما تھے اور کوئی مسودہ دیکھ رہے تھے۔میز پر ایک کتاب رکھی تھی جس کا نام ''آدھا چاند آدھا سورج'' تھا۔رسمی سلام و آداب کے بعد میں نے اظہر کو کتاب کی طرف متوجہ کرتے ہوئے آہستہ سے کہا یہ کیسی کتاب ہے ''آدھا تیتر آدھا بٹیر'' اظہر نے قتیل شفائی صاحب سے کہا کہ دیکھئے یہ نوجوان کیا کہہ رہا ہے؟ غالباً انہوں نے میری بات سن لی تھی پنجابی میں فرمانے لگے کہ اس نوجوان کا ''مہاندرا'' بھی تجھ سے ملتا ہے اور مسکرا دیئے۔وہ مجھے اظہر جاوید کی شوخی طبع کے آئینہ میں دیکھ رہے تھے۔

ایک مرتبہ گورنمنٹ انبالہ سکول سرگودھا میں ایک مشاعرہ ہوا۔اس میں اظہر جاوید کے ساتھ میں بھی شریک تھا، شاعری کا نیا نیا شوق تھا۔جب مجھے سٹیج پر اپنا کلام سنانے کیلئے دعوت دی گئی تو موسم خوشگوار ہونے کے باعث میں نے اپنی جرسی

کندھوں پر ڈال لی اور سٹیج کی طرف روانہ ہوا۔ پیچھے سے اظہر نے میرا دامن کھینچا اور کہا ''یہ جرسی ادھر رکھتے جاؤ، تم مشاعرہ پڑھنے جا رہے ہو کرکٹ کی فیلڈ میں نہیں'' مجھے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا اور ان کے کہنے پر عمل کیا۔

میں ان کے ادبی سفر میں ان کے ساتھ ساتھ رہا اور ان کو تعاون پیش کرتا رہا۔ جب وہ ماہنامہ ''عکسِ نو'' کی ادارت میں حصہ دار بنے تو میرا کلام ''عکسِ نو'' کی زینت بننے لگا۔ وہ روزنامہ ''امروز'' میں میگزین کے انچارج بنے تو میری غزلیں روزنامہ ''امروز'' میں چھپنے لگیں۔ جب انھوں نے ''عکسِ نو'' اور ''امروز'' کے بعد ماہنامہ ''تخلیق'' کا اجراء کیا تو میں نے ''تخلیق'' میں اپنا کلام اشاعت کے لئے بھیجنا شروع کر دیا۔ انھوں نے میری تخلیقات کو ہمیشہ اہمیت دی اور نمایاں طور پر شائع کیا۔ ''تخلیق'' کے ذریعے اظہر جاوید نے مجھے ایک مستقل پہچان دی۔

خانوادۂ جوہر نظامی کے ساتھ ان کا ادبی تعلّق ہمیشہ قائم رہا۔ جناب جوہر نظامی کا ذکر استاد ہونے کے ناتے نہایت فخر سے کرتے۔ بنیادی طور پر ہم ایک ہی استاد کے شاگرد تھے اس لئے ہمارا تعلق شاعری کے ایک ہی دبستان سے تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ آگے چل کر ہم ادب کے الگ الگ راستوں پر چل پڑے اور اپنا اپنا تشخّص اور مقام پیدا کرنے کی کوشش کی۔

پچھلے کچھ مہینوں سے ''تخلیق'' ذرا تاخیر سے مل رہا تھا۔ ''تخلیق'' کا فروری 2012ء کا شمارہ اس مرتبہ 7 فروری کو بذریعہ ڈاک موصول ہوا تو میری خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ دو ہی دن میں اس کا سرسری جائزہ لے لیا۔ اس مرتبہ جناب جوہر نظامی مرحوم پر علی رضا صاحب کا مضمون، میری غزل اور خط اور آفتاب راجا کی غزل ''تخلیق'' کے تازہ شمارے کی زینت بنے ہوئے تھے۔ اظہر جاوید کے ہاتھ چومنے کو جی چاہا۔ 9 فروری کو میں نے فون پر ''تخلیق'' کی بروقت ترسیل اور اتنی ساری چیزیں ایک ساتھ چھاپنے پر دل سے شکرّیہ ادا کیا۔ وہ کہنے لگے ''بھئی یہ تو میرا فرض ہے''۔ پھر والدگرامی پر مضمون کی بات کی، اس پر خوشی اور فخر کا اظہار کیا۔ اور کہا کہ ''استادِ محترم پر ایک مضمون مجھ پر قرض ہے'' میں نے ہنستے ہوئے کہا ''سوچ لو کہیں یہ قرض سود میں نہ بدل جائے'' بولے کہ ''میرے ساتھ اتنے کام لگے ہیں کہ فرصت ہی نہیں ملتی جب بھی ذرا مہلت ملی انشاءاللہ جناب جوہر نظامی پر ضرور مضمون لکھوں گا''۔ پھر جوہر نظامی ہی کے حوالے سے ایک بات اور پوچھی۔ آخر میں پھر اس کا شکریہ ادا کیا اور فون بند ہو گیا۔ یہ ساری گفتگو ایک خوشگوار ماحول میں ہوئی۔ ان کا لہجہ توانا تھا کسی قسم کی کوئی کمزوری محسوس نہ ہوئی۔ ان کی گفتگو میں کوئی جھول نہ تھا۔ کہیں دور دور تک اس بات کا شائبہ نظر نہ آیا کہ یہ شخص یوں اچانک ہم سے بچھڑ جائے گا۔

14 رفروری کی تاریخ یاد رہے گی۔ دن کے دو بجے اسلام آباد سے میرے بھائی فرّخ راجا کا فون آیا کہ اظہر جاوید اللہ کو پیارے ہو گئے۔ دل دھک سے رہ گیا۔ جی چاہتا تھا کہ کوئی کہہ دے کہ یہ ''خبر غلط ہے''۔ ادھر ایکسپریس ٹی وی پر اظہر جاوید کی وفات کے حوالے سے پٹی چلنے لگی اور میری آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔ حق تعالیٰ اس غنی مزاج شخص کی مغفرت کرے۔

◆◆◆

کچھ اظہر جاوید کے بارے میں

ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش

ماہنامہ ''تخلیق'' کے ''اظہر جاوید نمبر'' کے مطالعے کے بعد مجھے یہ بات شدت سے محسوس ہوئی کہ اظہر جاوید مرحوم کی ذات سے جڑے عشق و محبت کے افسانے دراصل احساسِ محرومی کے اشاریے ہیں۔ اظہر جاوید کو اپنی والدہ کی جانب سے ملنے والی نسبتاً کم توجہ اور محبت نے ان کے اندر دوسروں سے محبت کرنے کے جذبے کو تحریک دی۔ چنانچہ ایامِ جوانی میں انھوں نے جو بھی عشق کیے، وہ ایک طرح سے مادرانہ محبت کی کمی کے مداوے کی بالواسطہ کوششیں تھیں۔ بعد ازاں شادی شدہ خواتین سے روابط (تعلق داری) قائم کرنے کے پیچھے بھی ماں کی محبت کو تلاشنے یا کھوجنے کا جذبہ ہی کارفرما تھا۔ Mother Fixation، اظہر جاوید کا ایک نفسیاتی مسئلہ تھا جو مختلف صورتوں میں اپنا اظہار کرتا رہا۔ پختہ سال، تعلیم یافتہ، مہذب اور شعر و ادب میں دلچسپی رکھنے والی خواتین، اظہر جاوید کے لئے غیر شعوری طور پر، ماں کا نعم البدل تھیں۔ بعض لوگ، خواتین کے معاملے میں، اظہر جاوید کی دلچسپی کو ٹیڑھی نظر سے دیکھتے رہے، جو فی الاصل ان کی کج بینی تھی۔

اظہر جاوید کو جب ان کے لاڈلے بیٹے، سونان نے ایک دن باتوں باتوں میں یہ کہا: ابو یار! اب تو آپ تتلیوں کا پیچھا چھوڑ دیں۔ اب آپ بوڑھے ہو گئے ہیں''..... اچانک (اظہر جاوید) سنجیدہ ہو گئے اور بولے: بیٹا! مجھے غلط مت سمجھنا۔ تمھاری جان کی قسم، میں نے ہمیشہ پاک محبت کی ہے!''..... یہی وہ اہم نکتہ ہے جو اظہر جاوید کی ذات سے منسوب لاتعداد ''عشقیہ وارداتوں'' کی اصل حقیقت کو منکشف کر دیتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ماں کی جانب سے محبت اور توجہ کی کمی نے ان کے اندر تشنگی اور احساسِ محرومی پیدا کر دیا تھا، جو پچاس سال کی عمر تک خارجی دنیا میں ماں کی ممتا کو کھوجتا رہا اور بعد کے برسوں میں ان کے داخل میں جا بسا: نتیجتاً ان میں تصویرِ مادر کا پہلو نمایاں تر ہونے لگا اور یوں ممتا کا جذبہ ان پر غالب آتا چلا گیا۔

ہر ماں کا اپنی بیٹی سے ایک منفرد نوعیت کا جذباتی رشتہ ہوتا ہے جس میں باہمی اعتماد کے علاوہ مشورے دینے، مشورے لینے، سمجھانے اور ڈانٹنے کا عمل بھی شامل ہوتا ہے۔ اظہر جاوید کی زندگی کے آخری بیس بائیس برس میں ماں کا یہ روپ ان کی ذات میں کچھ اس طرح رچ بس گیا تھا کہ وہ دفترِ تخلیق میں آنے جانے والی ادب دوست، نوجوان خواتین کو ایک ماں کی طرح ڈانٹنے

سمجھانے اور نصیحتیں کرنے لگے تھے۔ تخلیق کے یادگار ''اظہر جاوید نمبر'' میں بانو قدسیہ کے ساتھ ان کی تصویر ایک طرف محترمہ بانو قدسیہ سے والہانہ عقیدت کا ثبوت مہیّا کرتی ہے تو دوسری طرف یہ تصویر اظہر جاوید کے باطن میں موجود ماں کی محبت کو ترسے ہوئے اس بچے کا برملا اظہار بھی ہے جو اپنی ماں کی گود میں پناہ لینا چاہتا ہے۔ اظہر جاوید کی نظم ''ایک بوڑھے مریضِ دل کی فریاد'' اس پہلو کو اجاگر کرتی ہے کہ انھیں اپنی ماں کی طرف سے اس طرح کی وافر محبت اور توجہ نصیب نہ ہو سکی؛ جس کے وہ آرزومند تھے اور اس کمی کو دور کرنے کے لیے وہ خود کو تاحیات دیگر خواتین کے ساتھ پرخلوص اور بے داغ محبت بھرے رشتوں میں پروتے رہے۔

اظہر جاوید کی مذکورہ بالا نظم کی درجِ ذیل سطور میں ماں کے حوالے سے ان کے اندرونی کرب اور احساسِ محرومی کا واضح اظہار ہوا ہے:

''تم اپنی ساری شفقت اور ساری ممتا
میرے بڑے بھائی پہ نچھاور کرتی تھیں
تب میں ترسا کرتا تھا
یہ اب برسوں میں سمجھا ہوں
اس کی صورت
میرے باپ سے ملتی تھی
اور تمھارے دل میں، ماں
اپنے ماضی کی یادوں کی
دکھ اور سکھ کی رت کھلتی تھی
اب بھی جب بچوں کے بچے
اپنی ماں سے لپٹے ہیں
میرے زخم تڑختے ہیں
ایسا کرلو
نیند کے روپ میں آ کر،
میرے ماتھے کو چھولو
اپنی گود میں بھرلو، ماں!

آخر کار اظہر جاوید اپنی اس خواہش یا خواب کی تکمیل کی خاطر اس آس پر ابدی نیند سو گئے کہ مرنے کے بعد نہ صرف یہ کہ

لحد' ماں کی نرم وگداز گود میں تبدیل ہو جائے گی بلکہ ماں ان کے ماتھے کو چھو کر ان کی ساری حسرتوں اور محرومیوں کو گلاب کے پھولوں ایسے بوسوں میں بدل دے گی۔ ان کی محوّلہ بالا نظم کی قرأت کریں تو اظہر جاوید کے خواتین کے ساتھ ربط و تعلق کا سارا پس منظر ہی تبدیل ہو جاتا ہے اور وہ لوگ جو عمر بھر انھیں ''رئیس العاشقین'' کے خطاب سے نوازتے رہے' انھیں اپنی رائے پر نظرِ ثانی کرنا پڑے گی۔ اظہر جاوید کی دوسروں کو دعائیں دینے کی عادت بھی درحقیقت ایک ماں کی اپنے جگر گوشوں کو دعائیں دینے ہی کا ایک علامتی انداز تھا...... ''جیتے رہو' شاد باد رہو' سکھی رہو' جیسے دعائیہ کلمات' ممتا کے جذبے سے سرشار ہستی ہی کے منہ سے ادا ہو سکتے ہیں۔ بقولِ سحر حفیظ ''اتنی دعائیں تو مجھے زندگی میں شاید اپنے ماں باپ سے بھی نہیں ملی ہوں گی جتنی دعائیں ان (اظہر جاوید) سے ملیں۔''

دوسری طرف سیدہ نسرین نقاش نے اظہر جاوید کے بارے میں جو رائے دی ہے' وہ ان کی غلط فہمی کا نتیجہ ہے...... لکھتی ہیں: چونکہ اس دشت (یعنی عشق و عاشقی کے رنگین جہانوں کی سیّاحی) میں انھوں نے ایک عمر بتائی ہے اور لبوں سے محبت اور مہ لقاؤں اور مہ جبینوں کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر رہ کر ان سے چار چار عشق بھی کیے ہیں: اس میدان کے تجربہ کار اور ماہر کھلاڑی ہیں۔''

میرے خیال میں موصوفہ' ان کی زندگی کی ظاہری عاشقانہ مزاج روش کے عقب میں موجود اس سچائی کو نہ پڑھ سکیں جو ایک بجھی ہوئی تحریر کی صورت میں ان کی شخصیت کے شوخ متن کے بین السطور میں سدا موجود رہی تھی۔

لیکن بقولِ تسنیم منٹو: ''ہر عورت ان کے لیے ایک حسینہ تھی اور ان حسیناؤں کی زندگیوں کے مسائل حل کرنے میں انھوں نے اپنے مقدور کے مطابق ساتھ بھی دیا۔''

یہاں ایک بار پھر ہمارے سامنے اسی ماں کا پیکر نمودار ہوتا ہے جو اپنی بیٹی کے ازدواجی اور عائلی مسائل اور معاملات کو درست رکھنے میں اس کی ہر طرح سے مدد اور رہنمائی کرنے پر آمادہ رہتی ہے۔ علاوہ ازیں قریبی احباب کے بچوں سے پیار محبت کا اظہار کرنا' انھیں ٹافیاں اور چاکلیٹ لا کر دینا' ان سے میٹھی میٹھی باتیں کرنا' دراصل اسی احساسِ محرومی کا مداوا کرنے کی کاوش تھی جو انھیں اپنی والدہ کی طرف سے محبت کی صورت میں خاطر خواہ نہ مل سکی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اظہر جاوید سراپا محبت بن کر اس کمی کو تاحیات فرو کرنے میں مصروفِ عمل رہے۔ وہ اس محبت کو بے دریغ لٹا کر خود کو ذہنی اور جذباتی سطح پر آسودہ اور مطمئن کر سکے یا نہیں' یہ ایک سوالیہ نشان ضرور ہے! مگر عجیب اتفاق یہ ہے کہ اس کارگہِ شیشہ گری کو الوداع کہنے کے لیے بھی اللہ نے اُن کے لئے محبت کے عالمی دن یعنی ویلنٹائن ڈے ہی کا انتخاب کیا۔

◆◆◆

اظہر جاوید

تلقین

اچھی لڑکی سچ کہتی ہو
کیوں خوابوں میں جیتا ہوں
خود اپنے ارمانوں کا
زہر ہی کیوں میں پیتا ہوں
تم کہتی ہو
میں نے عُمر کے سارے سال گنوائے ہیں
پیار وفا کے نام پہ میں نے
زخم ہمیشہ کھائے ہیں
تم کہتی ہو
لڑکیاں، چڑیاں ہوتی ہیں
ایک منڈیر سے دانہ چُن کر
دوسری چھت پر اُڑ جاتی ہیں
لوٹ کے پھر نہیں آتی ہیں
اچھی لڑکی!
تُم نے آج جنم دن پر
مجھ کو جو سمجھایا ہے
اُس نے میری آنکھوں سے
چھاجوں مینہ برسایا ہے
کیا کیا درد جگایا ہے

اچھی لڑکی!
یہ تلقین اور عقل کی باتیں
سرخ آنکھوں پر
لیکن تم نے، مُجھ سے کیا رشتہ جوڑا ہے
کیوں اپنی ہمدردی کا رُخ
میری جانب موڑا ہے؟
کیا یہ تعلّق خوابوں کی تمہید نہیں؟
کیا تم بھی
عینی، مومل، چندا اور ناہید نہیں؟
جانے دو
زیست کی آخری سرحد پر
مُجھ کو میرے حال پہ چھوڑ دو
جھوٹی سچی اُمیدوں کا
ناتا توڑ دو
خوابوں اور سرابوں میں
مجھ کو دو دن جی لینے دو
جیتے جیتے مرنے دو

OOO

اخلاق عاطف

اہلِ ''تخلیق''، تجھے یاد کریں گے صدیوں

کوئی پروانہ کوئی گُل نہ ستارا کوئی
ڈھونڈ کے لائیں کہاں سے ترے جیسا کوئی

اِس طرح چھوڑ کے جاتا نہیں اپنا کوئی
اِس طرح توڑ کے جاتا نہیں ناتا کوئی

جیسے ہنستے ہوئے چُپ چاپ ہُوا تُو رخصت
بزمِ یاراں سے بھلا یوں بھی ہے جاتا کوئی؟

اِس سے بہتر تھا کہ ہم راہ تو تکتے رہتے
جانے والے، جو کیا ہوتا بہانہ کوئی

اب بھی لاہور ہے آباد، مگر یوں جیسے
یہ حسیں شہر، گنوا بیٹھا خزانہ کوئی

ایک جگنو، کہ تھا مہتاب صفت، سب سے جُدا
یوں ''ادب رات'' میں کرتا ہے اُجالا کوئی؟

خوش جبینوں کے لیے عام تھی خیراتِ وفا
اُس کا اسلوبِ تعلّق تھا کرشما کوئی

وہ گیا ہے، تو ہے ''بھگوان گلی'' بھی سُونی
اب کنہیّا ہے یہاں اور نہ کرشنا کوئی

وہ دیاوان، دَیا کرتا تھا سب پر یکساں
اُس کا اندازِ مروّت تھا کہ تحفہ کوئی

مجھ سے سرگودھا کے احباب کی خبریں لینا
پوچھنا سب کا، ہے کس حال میں پیارا کوئی

کبھی بزمی[1]، کبھی علوی[2]، کبھی ذکرِ ضامن[3]
اُسے مطلوب تھا یاروں کا حوالا کوئی

'گیتاں[4] دی گونج' میں بھی ساتھ تھی اُس کی شفقت
یاد آئے گا وہ، جب گونجے گا نغمہ کوئی

اہلِ ''تخلیق'' تجھے یاد کریں گے صدیوں
توڑ پائے گا نہ چاہت کا یہ رشتا کوئی

تُو حسیں فکر، حسیں بخت تھا اظہر جاوید
تیرا مسکن ہو حسیں خُلد کا گوشا کوئی

1- پرویز بزمی 2- سلطان علوی 3- ضامن علی حیدری (سرگودھا کے اہلِ قلم، اظہر جاوید کے زمانۂ نوجوانی کے گہرے دوست)
4- پنجابی فلمی گیتوں پر میری تحقیقی کاوش، 1947ء تا 2006ء کے پنجابی گیتوں کی تلاش اور اس کام کی تکمیل کے لیے مرحوم نے ہر طرح میری حوصلہ افزائی کی، اور تعاون کیا۔

ماہنامہ ''تخلیق اظہر جاوید نمبر'' پر ایک نظر

انور سدید

اردو کے ممتاز شاعر اور پنجابی کے معروف کہانی کار اظہر جاوید نے عہد کیا تھا کہ وہ جب تک زندہ ہیں ماہنامہ ''تخلیق'' کو جاری رکھیں گے۔ اتفاق دیکھیے کہ انہوں نے ''تخلیق'' کا فروری 2012ء کا شمارہ شائع کیا اور ''تخلیق'' کی اشاعت کے بیالیسویں سال میں قدم رکھا ہی تھا کہ انہیں کوہِ ندا سے بلاوا آ گیا اور وہ اپنا تام جھام چھوڑ کر اس دنیا سے اُٹھ گئے۔ گویا انہوں نے ''تخلیق'' کے اشاعتی عمل کا پیمان پورا کر دیا تھا۔ پڑھنے والوں کو اظہر جاوید کا مرتّبہ ''تخلیق'' کا آخری شمارہ اور ان کی ناگہانی وفات کی خبر جو حرکتِ قلب بند ہو جانے کا نتیجہ تھی ایک ساتھ موصول ہوئے۔ اب ادبی دنیا میں یہ افواہیں گردش کرنے لگیں کہ جس طرح ماضی میں صہبا لکھنوی، تاج سعید، ڈاکٹر فہیم اعظمی، شبنم رومانی، ڈاکٹر وزیر آغا، احمد ندیم قاسمی اور پیام شاہجہان پوری کی وفات کے بعد رسالہ ''افکار''، ''جریدہ''، ''صریر''، ''اقدار''، ''اوراق''، ''فنون'' اور ''تقاضے'' جیسے ادبی رسائل بند ہو گئے تھے، اسی طرح رسالہ ''تخلیق'' بھی اشاعت کا سفر جاری نہ رکھ سکے گا۔ جناب اظہر جاوید کے بیٹے سونان جاوید نے جب یہ افواہیں سنیں تو عہد کر لیا کہ ''تخلیق'' اور اظہر جاوید کے نام کو زندہ رکھیں گے اور ''تخلیق'' حسبِ سابق چھپا کرے گا۔ ہر چند انہیں ادبی رسالے کی ادارت کی تربیت نہیں ملی تھی لیکن انہوں نے ہمّت کی کمر باندھ لی تو راستے کے پتھر ہٹتے گئے اور ''تخلیق'' کی اشاعت کے امکانات روشن ہوتے گئے اور پھر اہلِ ادب نے حیرت سے دیکھا کہ سونان اظہر جاوید نے ''تخلیق'' کا پہلا شمارہ ''اظہر جاوید نمبر'' کی صورت میں صرف دو تین ماہ کے قلیل عرصے میں شائع کر دیا اور یہ عہد بھی کیا کہ ''تخلیق'' اب ان کی رگِ جان ہے اور جب تک وہ زندہ ہیں ''تخلیق'' شائع ہوتا رہے گا۔'' ان کی رائے میں ''رسالہ تخلیق'' خانوادۂ اظہر جاوید کی پہچان ہے اور اس میراث کو قائم رکھنے کے لیے وہ ہمیشہ کوشاں رہیں گے۔''

''تخلیق'' کا اظہر جاوید نمبر جو 364 صفحات پر مشتمل ہے، اس وقت میرے سامنے ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ اظہر جاوید کو شخصیت اور فن کے حوالے سے یاد کرنے کے لیے پوری دنیا نے سونان کے ساتھ تعاون کیا ہے اور ایک سو سے زیادہ ادیبوں نے اس میں اپنے صادق جذبات اور حقیقی تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ ان میں اہم نام ڈاکٹر محمد علی صدیقی، جناب فخر زمان، عابد حسن

منٹو، بانو قدسیہ، عطیہ سیّد، خواجہ محمد زکریا، صابر لودھی، محمود شام، قاضی جاوید، طارق محمود، علی سفیان آفاقی اور کئی دیگر نامور ادبائے کرام شامل ہیں۔ ایک گوشہ غیر ملکی مصنفین کے لیے مختص کیا گیا ہے اور یہاں ہمیں محترمہ نیّر جہاں، نارنگ ساقی، کشمیری لال ذاکر، کیول دھیر، کرشن کمار طور، نذیر فتح پوری، پروین شیر اور تاشی ظہیر کے تاثرات اور احساسات سے آگہی ہوتی ہے اور ہر ادیب اظہر جاوید کے سانحۂ ارتحال پر غم زدہ دکھائی دیتا ہے۔

14/اگست 2011ء کو صدرِ پاکستان نے اظہر جاوید کی اعلیٰ ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں ''تمغۂ حُسن کارکردگی'' عطا کرنے کا اعلان کیا تھا جو 24 مارچ 2012ء کو انہیں دیا جانا تھا۔ افسوس یہ ہے کہ اظہر جاوید 14 فروری کو دنیا سے اُٹھ گئے اور یہ ایوارڈ ان کے صاحبزادے سونان نے وصول کیا۔ اظہر جاوید کے اس اعزاز کی تفصیل اور تصاویر اس پرچے میں شامل ہیں۔ تاریخی اعتبار سے اظہر جاوید کا محترمہ بے نظیر بھٹو کی پہلی جلاوطنی سے واپسی پر ان کے لیے جلسے کا اہتمام کرنا ایک یادگار واقعہ ہے۔ فوجی صدر ضیاء الحق کے دور میں جب بے نظیر بھٹو کی پذیرائی سے پارٹی کے جیالے بھی خوف کھاتے تھے تو اظہر جاوید نے ان کے لیے لاہور میں ایک عوامی جلسے کا اہتمام کیا جس کی تصویریں اس خاص نمبر کی زینت ہیں اور اظہر جاوید کی جرأت مندی کا ثبوت پیش کرتی ہیں۔ اس حصّے میں اظہر جاوید کی اپنی تقریر بھی شامل ہے جو انہوں نے لاہور میں بے نظیر بھٹو کے اس پہلے جلسے میں پیش کی۔ اس واقعے کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو دو مرتبہ وزیرِ اعظم بنیں لیکن انہوں نے اظہر جاوید کو کبھی یاد نہیں فرمایا اور اظہر جاوید نے بھی اپنی ''انا'' کا پرچم بلند رکھا اور کبھی کسی قسم کی مراعات کی توقع نہیں کی۔ اظہر جاوید کی اس نوع کی خودی اور خودداری کے متعدد واقعات عزیز میرٹھی، جمیل آذر، سرفراز سیّد، ملک مقبول احمد، سلطان رشک، عذرا اصغر، کشور ناہید اور سلمٰی اعوان نے اپنے ذاتی مشاہدے سے لکھے ہیں۔

اس پرچے کا ایک گوشہ اظہر جاوید کے اہلِ خاندان کے لیے مختص ہے۔ ان کی بہو سعدیہ سونان نے لکھا ہے کہ ''اظہر جاوید اسے اپنی بیٹی سلمونیہ کی طرح محبت سے نوازتے تھے۔'' سونان نے ایک مشفق باپ کا تذکرہ کیا ہے۔ ان دونوں کے لیے شفقت کا اظہار منظوم صورت میں اظہر جاوید نے کیا ہے۔ ایک اور نظم میں اظہر جاوید نے اپنی مرحومہ ماں کو یاد کیا ہے:

''جس دنیا میں چھوڑ گئی ہو
اس سے پیار نہیں ملتا
ممتا کیسے ملتی ہے؟''

یہ فریاد کرتے ہوئے اظہر جاوید کی سانس کی ڈوری ٹوٹ گئی۔ اس نظم میں ایک مریضِ قلب کی فریاد مجسّم دُعا بن گئی ہے۔

''تخلیق'' کے نئے جواں سال مدیر سونان اظہر نے اس پرچے میں اپنے والدِ گرامی کے لیے لکھنے والوں کے عقیدت کے پھول جمع کیے ہیں۔ عابد حسن منٹو کی نظر میں اظہر جاوید محبتوں کا سفیر تھا۔ ڈاکٹر سلیم اختر نے انہیں ایک مہربان دوست قرار دیا

ہے۔کشور ناہید نے انہیں آبرومند شاعر شمار کیا ہے۔ سیما پیروز کی رائے میں ''وہ تنہا راستوں کا مسافر تھا۔ امینہ عنبرین نے اظہر جاوید کی ذات میں ایک اچھے دوست اور اچھے انسان کو دیکھا۔ سلطان رشک غمِ دوست میں آنسو بہاتے نظر آتے ہیں۔ خاکہ نگاری کے فنی زاویے سے جناب صابر لودھی، یونس جاوید، نارنگ ساقی، بشریٰ اعجاز، مرحب قاسمی، سحر حفیظ، دردانہ نوشین خان نے شخصی اور ذاتی مطالعے سے ان کے نقوشِ ذات پیش کیے ہیں، سلطان احمد علوی کا مضمون اظہر جاوید کے بچپن کی یادوں پر مشتمل ہے۔ ایک اہم باب اظہر جاوید کے خطوط پر مشتمل ہے۔ یہ باب ان کی اس سعی و کاوش کا مظہر ہے جو انہوں نے احمد ندیم قاسمی اور وزیر آغا کے باہمی تنازعے کو ختم کرانے کے لیے کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ اس باب میں اظہر جاوید کی صلح کل شخصیت اور عقیدت کا نقش ابھرتا ہے۔ سونان صاحب نے ایک سوالنامے میں اظہر جاوید کے ساتھ ادیبوں کے ذاتی تعلق کی کیفیت دریافت کی۔ اس باب میں لطیف قریشی (امریکہ) شباب للت (انڈیا) اور ڈاکٹر طاہرہ بخاری (پاکستان) کے جوابات ان کے ذاتی زاویۂ نظر کو پیش کرتے ہیں۔ ''انجمن خیال'' اظہر جاوید کے دوستوں اور تخلیق کے لکھنے والوں کے خطوط سے مرتّب کی گئی ہے۔ یہاں ہر شخص دل گرفتہ نظر آتا ہے۔ پروفیسرز ہیر کنجاہی، امین راحت چغتائی، صفدر سلیم سیال، رضی الدین رضی اور ایس ایم معین قریشی کے خطوط نثری مرثیے ہیں۔

اس نمبر کا خوبصورت سرورق اردو کے نامور شاعر فیض احمد فیض کی بیٹی سلیمہ ہاشمی نے بنایا ہے، یہ ایسا نقش ہے جس میں اظہر جاوید ہم سب کی طرف دیکھ رہے ہیں اور ان کے ہونٹوں پر ایک زندہ مسکراہٹ ہے۔ ایک اہم باب اظہر جاوید کی اپنی غیر مطبوعہ اور مطبوعہ تحریروں کے لیے وقف کیا گیا ہے۔ نادر و نایاب تصویروں نے اس پرچے کو مصوّر اور زمانی یادگار بنا دیا ہے۔ وہ تصویر مجھے سب سے اچھی لگی جس میں احمد ندیم قاسمی ''تخلیق'' کی تیسویں سالگرہ پر تقریر کر رہے ہیں اور اظہر جاوید گوش بر آواز ہے۔

یہ خوبصورت، دلآویز اور صادق احساسات کا نمائندہ پرچہ چھاپنے اور اظہر جاوید کی یادوں کے نقوش محفوظ کرنے پر سونان اظہر مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اللہ زورِ ادارت زیادہ کرے۔ ضخامت 360 صفحات، سرورق خوبصورت، کاغذ سفید، کتابت اُجلی، قیمت صرف تین سو روپے۔ ملنے کا پتہ: دفتر تخلیق، E-67-A-1، سپر ٹاؤن، گلی نمبر 3، ڈیفنس لاہور۔
(فون نمبر: 0321-8899007) (نوائے وقت، لاہور، 26/اگست 2012ء)

.....

شاہد بخاری

مشہور شاعر، ادیب، مترجم اور صحافی اظہر جاوید 42 سال سے معیاری ادبی ماہ نامہ ''تخلیق'' ہمارے ادب کُش ماحول میں زندہ رکھے ہوئے تھے۔ 16/فروری کو جب وہ بیماریِ دل کے ہاتھوں اچانک رخصت ہوئے تو دنیائے ادب میں ماتم کی کیفیت برپا ہوگئی۔ اس بات کا خدشہ بھی محسوس کیا گیا کہ ان کی سب سے اہم یادگار ماہ نامہ ''تخلیق'' بھی ان کے ساتھ ہی زیرِ زمین

چلا جائے گا مگر اظہر جاوید کے متحرک اور ذہین فرزند سونان اظہر نے قلیل مدت میں ''تخلیق'' کا ضخیم ''اظہر جاوید نمبر'' شائع کرنے کے ساتھ ساتھ اس عزم کا اظہار کر کے کہ ''تخلیق'' جاری رہے گا، اہلِ ادب میں طمانیت کی لہر دوڑا دی ہے۔

اظہر جاوید نمبر ان کی شخصیت اور فن کے بارے میں ایک ایسی یادگاری دستاویزی صورت اختیار کر گیا ہے جو مرحوم کی ادبی خدمات و کارناموں کو تادیر زندہ رکھے گا۔ اس نمبر کے صوری اور معنوی محاسن بڑے متاثر کن ہیں۔ ادب کی اہم شخصیات نے جن کا تعلق پاکستان ہی نہیں، بیرونِ پاکستان کے متعدد ممالک سے ہے، اظہر جاوید کی کثیر الجہات شخصیت اور ان کے کام کے بارے میں خیالات اور تاثرات بڑی محبت، عقیدت اور خلوص سے قلم بند کیے ہیں۔ ان مضامین سے مرحوم کی شخصیت کے متعدد خوب صورت پہلو روشن ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں اظہر جاوید نے شاعری، افسانہ، تراجم اور دیگر اصناف میں جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، ان کا جائزہ بھی مختلف مضمون نگاروں نے غیر جانب دارانہ اور بڑے مناسب انداز میں تحریر کیا ہے۔ اس شمارے کے بارے میں یہ بات خصوصی طور پر قابلِ ذکر ہے کہ اس میں مرحوم، ان کے اہلِ خانہ اور دنیائے ادب کی اہم شخصیات کی نہایت نادر تصاویر، آرٹ پیپر پر شائع کی گئی ہیں، جس سے اس نمبر کی جمالیاتی قدر و قیمت بہت بڑھ گئی ہے۔

ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا، ڈاکٹر انور سدید، ڈاکٹر یونس جاوید، سرفراز احمد سیّد، شاہد بخاری اور امینہ عنبریں کا بے لوث تعاون آئندہ بھی سونان اظہر کو حاصل رہے گا۔ 2005ء میں اظہر جاوید کی کہی گئی یہ غزل آج بھی حسبِ حال ہے، جو اس خاص نمبر میں شامل ہے ؎

عیاں ہے ان کی عیّاری، بڑا وہ نام رکھتے ہیں — وہ خود ملزم ہیں لیکن ہم پہ ہی الزام رکھتے ہیں
انہیں یہ زعم ہے وہ کج کلاہ و بندہ پرور ہیں — ہمیں یہ فخر ہے ہم فقر کا احرام رکھتے ہیں
ہم اپنے ہاتھ پر رکھتے ہیں سچائی کے سورج کو — وہ اپنی کہنہ سوچوں میں بھیانک شام رکھتے ہیں
ہمیں دعویٰ نہیں ہے نیک نامی، پارسائی کا — وہ خرقہ پوش ہیں، اپنی بغل میں جام رکھتے ہیں
انہیں یہ خوف ہے وہ لڑکھڑا کر گر ہی جائیں گے — وہ ہاتھوں میں تملّق کی چھڑی کو تھام رکھتے ہیں
یہ ان کا شوق ہے جو جھوٹ کہنے پر انہیں ٹوکیں — زبانِ خامہ پر ان کے لئے دُشنام رکھتے ہیں
جو کرتے ہیں، بہت چرچا دیانت کا، امانت کا — وہ اپنا مول رکھتے ہیں، وہ اپنا دام رکھتے ہیں
بہت مغرور پھرتے ہیں، گھمنڈی بن کے رہتے ہیں — یہی ہیں لوگ، عبرت ناک جو انجام رکھتے ہیں
کبھی فریاد کرنے پر کسی دربار سے اُن کو — ملے بخشیش، اس کا نام یہ انعام رکھتے ہیں

ہمیشہ فیض پاتے ہیں وہی اظہرؔ زمانے میں
نہیں فن سے، خوشامد سے فقط جو کام رکھتے ہیں

(''اخبارِ جہاں'' کراچی)

انوار فیروز

ادیب، شاعر، صحافی، دانشور خاص طور سے اپنے وطن عزیز سے محبت کرنے اور اس کا دم بھرنے والے لوگ دنیا سے اُٹھتے جا رہے ہیں۔ یہ حسّاس لوگ اپنے ملک کی بگڑتی ہوئی صورت حال اور اپنے رہنماؤں کی بداعمالیاں دیکھ کر کڑھتے رہتے ہیں اور اپنا درد الفاظ کے پیکر میں ڈھال کر صفحۂ قرطاس پر بکھیرتے رہتے ہیں۔ کوئی سنے یا نہ سنے یہ حق کی آواز بلند کرتے رہتے ہیں اور اس میں انہیں تکالیف بھی اُٹھانا پڑتی ہیں۔

پچھلا سال کتنے ادیبوں اور شاعروں کو کھا گیا، کس کس کا نام گنواؤں، ان میں حمید اختر، منشا یاد، فرخندہ لودھی، مزاح گو شاعر فضل الٰہی بہار، اکبر حمیدی شامل ہیں اور اب حال ہی میں ماہنامہ ''تخلیق'' کے مدیر اظہر جاوید اور عباس نجمی بھی اللہ کو پیارے ہو گئے ہیں۔ ادھر بھارت سے خبر آئی ہے کہ ممتاز شاعر شہریار بھی اسی دار فانی سے عالم جاودانی کو سدھار گئے۔

اظہر جاوید سے ہمیں کچھ زیادہ ہی پیار تھا کیونکہ وہ ایک سچا اور کھرا انسان اور بے باک صحافی تھا۔ وہ سرگودھا سے لاہور آیا اور پھر یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ لاہور میں روزنامہ ''امروز'' سے وابستہ رہا، اس نے کبھی کسی کی غلط بات نہیں مانی۔ ہمیشہ اصولوں پر قائم رہا۔ نوکری چھوڑ دی مگر آمریت کے آگے سر نہیں جھکایا۔ جس کے دل میں کھوٹ نہ ہو اس کا سر صرف اللہ کے آگے ہی جھک سکتا ہے۔ لاہور میں وہ اندرون اور بیرون ملک سے آنے والے ادیبوں اور شاعروں کا میزبان ہوتا تھا۔ جیسے ماہنامہ ''ادب دوست'' کے مدیر اعلیٰ اے جی جوش کا دسترخوان وسیع تھا، اسی طرح اظہر جاوید بھی مہمانوں کی دل کھول کر تواضع کرتا تھا۔ وہ گزشتہ 42 سال سے نہایت معیاری علمی و ادبی جریدہ ماہنامہ ''تخلیق'' شائع کر رہا تھا۔ اشتہار نہ ہونے کے باوجود وہ رسالہ باقاعدگی کے ساتھ شائع کرتا۔ لفافوں پر پتے بھی خود ہی لکھ کر پوسٹ کرتا اور ہم جیسے مفت خوروں کو پرچہ مفت بھیجتا۔ اس نے کبھی کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کیا۔ وہ درویش صفت انسان تھا۔ ہم حیران ہوتے تھے کہ یہ رسالے کے اخراجات کہاں سے پورے کرتا ہے۔ 240 صفحات کے رسالے کی قیمت 20 روپے رکھی ہوئی تھی۔ چند ماہ قبل کچھ ادیبوں اور شاعروں نے اس پر زور دیا کہ وہ رسالے کی قیمت میں اضافہ کرے تو اس نے بادل نخواستہ رسالے کی قیمت 50 روپے مقرر کی۔ اس پرچے میں بہت اچھا مواد پڑھنے کو ملتا تھا۔

پاکستان کے مایہ ناز شاعر قتیل شفائی جو پاکستان اور بھارت میں یکساں مقبول تھے، سے اظہر جاوید کی دوستی تھی۔ وہ ان کے ساتھ کئی بار بھارت کے دورے پر گیا اور وہاں مشاعرے پڑھ کر اپنا سکہ جمایا۔ اس نے بھارت کے اُردو نواز دوست کے ایل نارنگ ساقی کے بارے میں جو مضمون لکھا وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے جو ادیب اور شاعر بھارت جاتا ہے کے ایل نارنگ ساقی اس کی ہر طرح خدمت کرتے ہیں۔ ان کا مضمون پڑھ کر ہی ہم کے ایل نارنگ ساقی سے ملنے کے لیے بے تاب ہیں۔

جاتھوساحل بھی بھارت کے خوبصورت لہجے کے شاعر ہیں وہ بھارت میں بہت بڑے عہدے پر فائز ہیں۔ان کی بیگم بھی ان کی طرح بیوروکریٹ ہیں۔ دونوں ادب کے دلدادہ ہیں۔ جاتھوساحل بھی بھارت میں مشاعرے کراتے رہتے ہیں۔ان کی پاکستان میں اظہر جاوید اور ماہنامہ نیرنگ خیال کے مدیر سلطان رشک سے بھی دوستی ہے۔پچھلے سال مارچ میں بھارت میں مشاعرہ ہونا تھا۔ پاکستان سے شاعروں کے چناؤ کا کام جاتھوساحل نے اظہر جاوید کے سپرد کر رکھا تھا۔اظہر جاوید نے ہمارا نام بھی شامل کیا۔ہم نے اس سے کہا کہ ہماری بیٹی اور بیٹے کو بھی شامل کر لیتے کیونکہ ہم بیمار ہیں اور اکیلے سفر کرنے سے گھبراتے ہیں۔اس نے ہمیں لکھا کہ تم نے بیٹی اور بیٹے کے پاسپورٹوں کی فوٹو کاپی کیوں نہیں بھیجی۔اب جہاں تک اکیلے سفر کرنے کا سوال ہے مجھے دیکھو کہ میں کئی بار دل کا بائی پاس کرا چکا ہوں۔ پھر بھی تنہا سفر کرتا ہوں۔ بہرحال وہ مشاعرہ نہ ہو سکا۔کیونکہ بھارتی حکومت نے ویزے جاری نہیں کیے۔اس طرح ہم اظہر جاوید اور دوسرے لوگ بھارت نہ جا سکے۔

فروری کے شروع میں تخلیق کا 240 صفحات پر مشتمل خوبصورت شمارہ ملا جس میں اس نے ہماری غزل اور رنگین تصویر کے علاوہ خط بھی شائع کیا جس میں ہم نے اسے لکھا ''اپنا دل کیوں جلاتے ہو یار'' حساس ادیب شاعر اور صحافی لکھتے رہتے ہیں مگر کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔کسی زمانے میں جب میں روزنامہ تعمیر راولپنڈی کا چیف رپورٹر تھا تو قلمی نام سے چھ سات سطروں کا ایک کالم لکھتا تھا جس سے تہلکہ مچ جاتا تھا۔اب لیڈ سٹوری چھاپ دیں مگر ارباب اختیار کو جو کرنا ہے وہی کریں گے۔لوگ بھوکے مر رہے ہیں مگر وزیراعظم کہتے ہیں کہ ہم نے 80 فیصد وعدے پورے کر دیے۔نہ جانے کون سے وعدے، وعدے تو روٹی کپڑا اور مکان کے تھے جنہیں لوگ ترس رہے ہیں۔ ہر طرف تاریکی ہے۔کہیں روشنی کی کرن نظر نہیں آتی۔ ہمارے بعد آزاد ہونے والے ملک ترقی کر رہے ہیں مگر ہم.....مگر یار میں بھی تو دل جلاتا رہا ہوں۔اس لیے دل بڑھنے کی بیماری، شوگر، رعشہ اور نہ جانے کیا کیا ہو گیا ہے۔وزن کم ہوتا جا رہا ہے۔ہم تو ویسے بھی دھان پان ہیں۔''

اظہر جاوید باز نہ آیا۔دل جلاتا رہا۔ یہاں تک کہ اس جبر اور گھٹن کی فضا میں اس کا دل بند ہو گیا اور ایک توانا اور وطن دوست آواز ہمیشہ کے لیے بند ہو گئی۔ سچی بات یہ ہے کہ ہماری بیٹی نورین طلعت عروبہ نے اس کی موت کی خبر سنائی تو ہم گم صم رہ گئے۔کئی روز سکتے کی سی کیفیت طاری رہی ؎

موت سے کس کو رستگاری ہے آج وہ کل ہماری باری ہے

الوداع اظہر جاوید، خدا تمہاری قبر کو نور سے بھر دے۔

(روزنامہ ''خبریں'' اسلام آباد)

.....

علی سفیان آفاقی

ماہنامہ ''تخلیق'' گزشتہ چالیس سال سے مسلسل باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا ہے۔اس جریدے کو صرف ایک شخص تن تنہا شائع کرتا رہا ہے جسے نہ کسی سرمایہ دار کی مدد حاصل تھی اور نہ ہی ہمارے سرکاری اور غیر سرکاری ادارے ایک معیاری جریدے کو اشتہارات ہی فراہم کرتے تھے اور محض اظہر جاوید کی ذاتی کوشش، اَن تھک محنت اور لگن سے یہ جریدہ نہایت باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا اور مدیر نے یہ لحاظ رکھا کہ اس کا معیار نہ صرف برقرار رہے بلکہ اس میں اضافہ بھی ہوتا رہے۔اظہر جاوید اب مرحوم ہو چکے ہیں لیکن انہوں نے مسلسل چالیس سال تک انتہائی باقاعدگی سے اُردو ادب کی جو خدمات سرانجام دی ہیں وہ ہمیشہ ناقابل فراموش رہیں گی۔ان کی وضع داری کا تقاضا تھا کہ اہلِ قلم حضرات وخواتین کو بلا معاوضہ اپنے ڈاک خرچ پر دو ماہ بعد ''تخلیق'' ارسال کیا کرتے تھے۔اظہر جاوید نے کبھی لکھنے والوں سے شکوہ نہیں کیا اور اپنا معمول جاری رکھا۔''تخلیق'' میں لکھنے والے اور اس کے پڑھنے والوں میں ہندوستان کے علاوہ دیگر ملکوں کے افراد بھی شامل رہے ہیں جو باقاعدگی سے اپنی تحریریں ''تخلیق'' میں ارسال کرتے رہے۔سرورق سے لے کر آخری صفحے تک یہ ایک معیاری اور قابلِ مطالعہ جریدہ ہے۔پاکستان میں اُردو کی یہ خدمت ایک پنجابی مدیر نے انجام دی تھی۔اظہر بذاتِ خود اُردو شاعر ونثر نگار کے علاوہ پنجابی شعرا میں بھی اہم حیثیت کے مالک تھے۔ایک خوش اخلاق، انتہائی منکسر المزاج اور خوش مزاج انسان تھے۔ان کی اچانک وفات نے اُردو اور پنجابی ادب کے علاوہ اُردو جرنلزم کو ایک لائق اور قابلِ قدر مدیر سے بھی محروم کر دیا ہے۔''تخلیق'' شائع اور مرتّب کرنے کی ذمہ داری اب ان کے صاحبزادے سونان اظہر جاوید نے سنبھالی ہے۔وہ کہاں تک اپنے فرض سے انصاف کر سکیں گے۔اس کا ایک نمونہ زیرِ نظر ''تخلیق'' کا اظہر جاوید نمبر ہے۔اُمید ہے کہ اظہر جاوید مرحوم کے قلمکاران کے ساتھ بھی حسبِ سابق تعاون کرتے رہیں گے۔''تخلیق'' کا اظہر جاوید نمبر 364 صفحات پر مشتمل ہے جس میں پاکستان اور ہندوستان کے علاوہ دیگر ملکوں کے ممتاز اہلِ قلم حضرات وخواتین کی تحریریں شامل ہیں جن میں مرحوم کی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالی گئی ہے۔یہ اس اعتبار سے ایک دلچسپ اور یادگار شمارہ ہے جس میں اظہر جاوید، زندہ جاوید ہو کر نظروں کے سامنے نظر آتے ہیں۔لکھنے والوں کی طویل فہرست ہے۔مختصر یہ کہ اُردو کا کوئی قابل ذکر قلمکار نہیں جس کی تحریر اس شمارے میں شامل نہ ہو۔شاعروں نے انہیں نظموں کے ذریعہ خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔ان کا ایک انٹرویو اور خطوط کے علاوہ رنگین تصاویر بھی شمارے کی زینت ہیں۔خوبصورت سرورق سلیمہ ہاشمی نے بنایا ہے۔اس شمارے کو دیکھ کر یہ یقین پختہ ہوتا ہے کہ نئے مدیر و مالک سونان اظہر جاوید اپنے والد مرحوم کی وراثت کو سنبھال کر رکھیں گے۔پیشکش معیاری، قیمت تین سو روپے اور بھگوان سٹریٹ پرانی انارکلی لاہور سے دستیاب ہے۔

(''فیملی میگزین'' جولائی 2012)

قیصر نجفی

صوری و معنوی جمالیات سے معمور ''اظہر جاوید نمبر'' جب نظر نواز ہوا تو معاً تاریخِ ادب اردو کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ کہتے ہیں کہ سر سیّد احمد خان کے والد ایک مشّاق تیر انداز تھے..... بقول سر سیّد ''بچپن میں جب میرا تیر تودے میں نشانے پر بیٹھا تو حاظرین نے بیک زبان ہو کر کہا۔ ''مچھلی کے جائے کو تیرنا کون سکھائے!'' ہمارے نزدیک یہ کہاوت سونان اظہر پر بھی صادق آتی ہے۔ بلاشبہ مضامین کی چھان پھٹک اور انتخاب میں اسے بعض بزرگانِ ادب بلکہ شیفتگان اظہر کی اعانت و رہنمائی حاصل رہی، لیکن یقیناً متعدد اور بھی مراحل تھے، جو اس حوصلہ مند نوجوان نے خود طے کئے۔

یہ سچ ہے کہ کسی آدمی کی اہمیت کا اندازہ اسکے جدا ہونے یا دنیا سے اٹھ جانے کے بعد ہوتا ہے۔ لیکن اس بات کا اطلاق اظہر جاوید پر نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ وہ زندگی میں احباب کے لئے جتنے اہم رہے، اتنے ہی مرنے کے بعد اہم ہیں.....اس بات کا واضح ثبوت منثور و منظوم وہ نذرانہ ہائے محبت و عقیدت ہیں جو ''اظہر جاوید نمبر'' کے سینکڑوں صفحات پر محیط ہیں۔ فی زمانہ کسی قلمکار کی یادنگاری کے ذیل میں اس وفور سے تخلیقات نظم و نثر ہماری نظروں سے نہیں گزریں۔ اظہر جی کی ''اپنی بات'' کی طرح سونان کی ''پہلی بات'' نے بھی دل موہ لیا ہے۔ اسکے عزم بالجزم کو دیکھ کر ''احیائے تخلیق'' کا صد فی صد یقین ہو گیا ہے۔ رب تعالیٰ اس کا حامی و ناصر ہو۔

''اظہر جاوید نمبر'' کے دیگر مشمولات کا آغاز اردو ادب کے مرد آہن ڈاکٹر انور سدید کے ہمہ جہت مضمون ''غم محرومیٔ اظہر جاوید'' سے ہوتا ہے۔ یہ مضمون اس نمبر میں خاصے کی چیز ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جس اجمال لیکن جامعیت سے اظہر جاوید کے فن اور شخصیت کے متنوع پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے اور جس جمالِ فن سے اپنے اندوہ گیں اور کرب آگیں جذبات و احساسات کو ان میں آمیز کیا ہے، وہ ان جیسے ادبی جینئس کا حصہ ہے۔ غالبؔ سے معذرت کے بغیر..... ''وہ لکھے اور پڑھا کرے کوئی۔''

ہر چند اظہر جاوید پر ''تخلیق'' کی ادارت محیط تھی، مگر رسالہ ''تخلیق'' ان کے تخلیقی عمل میں مانع و مزاحم نہیں تھا۔ اظہر جی نے شاعری کی اور بھرپور انداز میں کی۔ خواجہ محمد زکریا جیسے ثقہ نقاد نے اس کی دل کھول کر تحسین کی ہے۔ خواجہ صاحب کے کہے کو ہم سند کا درجہ دیتے ہیں.....اظہر جی کی شاعری پر تبصرہ آرائی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اظہر جاوید ایک رومانی شاعر تھے..... ہمارا عہد رومانیت کا دشمن عہد ہے۔ روزمرہ کے حالات سنگین حقائق کو اتنی شدت سے سامنے لاتے ہیں اور بنیادی ضروریات کے حصول کی تگ و دو ہمیں اس طرح اسیر کر لیتی ہے کہ رومان اور رومانی جذبات گھٹ کر رہ جاتے ہیں۔ سعدیؔ نے کہا تھا کہ ایک بار دمشق میں اس

شدّت کی خشک سالی ہوئی کہ لوگوں نے ''عشق'' کو بھلا دیا۔ ہمارا زمانہ بھی کم وبیش ایسا ہی ہے۔ اس لئے ہمارے ہاں رومانی شاعری تو مل جاتی ہے لیکن اب کچھ عرصے سے کوئی شاعرِ رومان پیدا نہیں ہوا۔ اظہر جاوید سیاسی لحاظ سے بائیں بازو کی طرف جھکاؤ رکھتے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے کچھ عملی جدوجہد کی اور زیرِ عتاب بھی آئے۔ لیکن شاعری کو اس رنگ میں زیادہ ملوّث نہیں کیا۔''

سطور بالا میں خواجہ صاحب نے اظہر جی کی رومانیت کا ان کے نظریات کے تناظر میں جائزہ لیتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ اظہر جی نے شاعری کی آڑ میں نعرہ بازی کی اور نہ ہی اپنی شاعری کو سیاست کے لوث سے آلودہ کیا..... ہمارے خیال میں خواجہ صاحب نے بین السطور اظہر جی کو عہد حاضر کا 'شاعر رومان' قرار دیا ہے۔ ہم ان کی رائے پر صاد کرتے ہیں۔

مرتضٰی برلاس اردو غزل کا ایک بڑا نام ہے۔ وہ ایک صاحبِ طرز غزل گو ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صاحبِ اسلوب نثر نگار بھی ہیں۔ شعر کی طرح نثر میں بھی ان کا لب ولہجہ کھرا اور بے باک ہے۔ ماضی قریب میں ان کی خودنوشت کی گونج اُردو دنیا میں بہر سو سنائی دی۔ برلاس صاحب کا مضمون ''سراپا پراسرار..... اظہر جاوید'' صاف گوئی کی ایک عمدہ مثال ہے۔ ہماری ایک دراز عرصے سے ان سے یاد اللہ ہے۔ جہاں تک ہمارے علم میں ہے برلاس صاحب اور اظہر جی کی گاڑھی نہیں چھنتی تھی (یہ بات انہوں نے چھپائی نہیں بلکہ اس کا برملا اعتراف کیا ہے) گو اس کا بظاہر کوئی سبب نہیں تھا، لیکن سوال اٹھتا ہے کہ مرنجاں مرنج طبائع کے دو افراد (ادیب وشاعر) کا ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے ایک دوسرے سے محض رسمی تعلق رکھنا چہ معنی دارد..... اس سوال کا بھی برلاس صاحب نے خود ہی جواب دے دیا ہے۔

''عباس تابش نے جون 2004ء میں 'دبستان' کے نام سے ایک ادبی سلسلہ شروع کیا اور اس پر بطور سرپرست میرا نام شائع کر دیا۔ یہ پرچہ کافی ضخیم تھا اور اس پر لاگت بھی کافی آتی تھی۔ میری حیثیت اس میں محض ''اعزازی'' سرپرست کی تھی اور میں پرچہ کی تقسیم کے بارے میں قطعاً لاعلم تھا۔ اگر کسی دوست کو پرچہ بھیجنے کی خواہش ہوتی تو اس کا زرِ خرید نقد ادا کر کے پرچہ حاصل کرتا۔ مگر اظہر کو مجھ سے شکایت پیدا ہوئی کہ میں نے ان کو پرچہ نہیں بھیجا۔ جس کے بعد انہوں نے ''تخلیق'' کی اعزازی ترسیل کا سلسلہ روک دیا۔''

آپ نے دیکھا کہ اظہر جی سے تعلقات کے حوالے سے برلاس صاحب نے کسی لگی لپٹی سے کام نہیں لیا ہے اور سچ بلکہ صرف سچ بیان کر دیا ہے۔

یونس جاوید اور محبت اس حد تک ایک دوسرے میں آمیز ہو چکے ہیں کہ وہ دن دور نہیں جب دونوں کا ایک ہی مطلب لیا جائے گا۔ خیر یہ ایک جملہ معترضہ تھا..... ہم نے یادنگاری کے ذیل بے شمار تحریریں پڑھی ہیں، مگر یونس جاوید کی اظہر جی کی یاد میں ''کبھی نہیں..... کبھی نہیں'' جیسی لکھی گئی تاثر آفرین تحریر نہیں پڑھی۔ کسی کو موت کے غم میں تڑپتے ہوئے اکثر لوگوں نے دیکھا

ہے لیکن موت کے غم کو کسی میں ڈوبتے ہوئے شاید ہی کسی نے دیکھا ہوگا۔ اظہر جی کی موت کا غم یونس جاوید کے قالب میں اس طرح سرایت کر چکا ہے کہ لگتا ہے یہ غم یونس جاوید کی صورت میں تجسیم ہو گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی لفظیات کے دردزا جھروکوں سے مجسم غم بن کر جھانکتے نظر آتے ہیں۔

''میّت کا پیلا پن اڑ کر میرے لہو میں آن شامل ہوا۔ دو تین عورتیں سوگوار بیٹھی تھیں۔ پھر نگاہ میں نمی نے دھندلا پن پیدا کر کے اسے خیرہ کر دیا سارا منظر لہو رنگ ہو کر دل پہ نقش ہو گیا..... میں اکیلا تنہا..... ویران گلی میں حیران آنکھوں سے آسمان کو تکنے لگا، جیسے عالم سکرات کا لمحہ ہو..... میں جوں کا توں گڑ گیا تھا اور اپنی ذات میں انجمن اجّی اتنا تنہا اس قدر اکیلا..... اور بے سروسامانی میں پتھر بنا تھا، ایک متحرک، تیز طرار، ہمہماتا ہوا، کلکاریاں مارتے کھلنڈرے بچے جیسا..... پارے کا بنا بوڑھا بالک یوں پتھر بھی ہو جائے گا، کبھی سوچا بھی نہ تھا۔''

صابر لودھی کی کوئی تحریر پہلے ہماری نظروں سے نہیں گزری۔ ان کا مضمون ''اظہر جاوید..... لے گئے خاک میں ہم داغ تمنائے نشاط'' ایک مسحور کن تحریر ہے۔ ان کی زبان میں ایک دلآویز ادبی نکھار پایا جاتا ہے جو ان کی زرخیزی ذہن پر دلالت کرتا ہے۔ لودھی صاحب ایک وسیع المطالعہ قلم کار ہیں۔ یادنگاری میں خاکہ نگاری کی جاذبیت پیدا کر کے انہوں نے خود کو دیگر قلم کاروں میں ممیّز کیا ہے بالخصوص اظہر جاوید کی انہوں نے جس فکری اخلاص سے تحلیل نفسی کی ہے، وہ قابلِ ستائش ہے۔

بانو قدسیہ صاحبہ کی عمر ہی میں نہیں ادب میں بھی بزرگی مسلّم ہے۔ انہوں نے اظہر جی کو ایک درویش تسلیم کیا ہے۔ درویشی، اظہر جی کی شخصیت کا ایک ایسا رُخ ہے، جس کا بانو قدسیہ صاحبہ نے کھوج لگایا اور انہوں نے ہی سب سے پہلے اس کا انکشاف کیا۔ وہ اس لئے کہ ''ولی را ولی می شناسد''۔ وہ اپنے مضمون ''اظہر جاوید۔ چند تاثرات'' میں رقم طراز ہیں:

''میں نے شروع میں اظہر جاوید کو ایک درویش کے طور پر یاد کیا ہے۔ یہ اس لئے نہیں کہ ہماری ساری زندگی درویشوں کے ساتھ وابستگی میں گزری ہے۔ اس لئے اب ہمیں ہر بندہ درویش ہی نظر آتا ہے۔ بلکہ جب آپ رابعہ بصری پر لکھی ہوئی اظہر جاوید کی کتاب پڑھیں گے تو آپ بھی اس میں ایک سچے اور کھرے درویش کو ضرور پہچان لیں گے۔''

ہمیں 2004ء میں بشریٰ رحمٰن کی معیت میں لدھیانہ (بھارت) جانے کا اتفاق ہوا۔ وہ چند روز جو ہم نے ان کے ساتھ وہاں بتائے، ناقابل فراموش ہیں۔ خصوصاً اس حوالے سے کہ ہم نے زندگی میں پہلی بار کسی خاتون میں درویش کے آثار دیکھے۔ پاکستان آنے کے بعد ایک روز وہ ہماری بیگم کی دعوت پر ہمارے گھر تشریف لائیں اور رات گئے تک ہم میاں بیوی سے باتیں کرتی رہیں۔ دورانِ گفتگو انہوں نے علم و معرفت کے وہ دریا بہائے کہ ہم دنگ رہ گئے۔ وہ تمام وقت خودشناسی و خداشناسی

کے اسرار و رموز کھولتی رہیں۔ ہمیں یہ اعتراف کرنے میں تامل نہیں کہ انہوں نے انسان اور کائنات کے حوالے سے جتنی باتیں کیں وہ فتاویٰ کا درجہ رکھتی ہیں.....اظہر جی کی یاد میں تحریر کردہ ان کے مضمون کا لب ولہجہ بھی وہی ہے۔ جس کا ہمیں ایک خوشگوار تجربہ ہو چکا ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے بینائی باطن (Inner Sight) کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسی حکیمانہ گفتگو کی ہے جو ایک درویشِ بے ریا ہی کر سکتا ہے۔ ''مشتے نمونہ از خروارے'' کے طور پر چند جملے ملاحظہ ہوں۔

- ''جانے کا سہولت آسا انداز تو یہی ہے ..... بہ نسبت اس کے کہ بستر گریز کرنے لگے اور سلوٹیں دہائی دینے لگیں.....اور رشتوں ناطوں کی اصلیت بھی کھلنے لگے۔''
- ''ان کی خودی اور خودداری ایک سوال چھوڑ گئی۔''
- ''ان کا انداز فقیرانہ اور اعتراف خسروانہ تھا۔''
- ''سچ پورے کا پورا بتایا نہیں جا سکتا اور جھوٹ سارے کا سارا چھپایا نہیں جا سکتا۔''
- ''ادھر بھگوان گلی کے اندر.....حرف وآگہی کا بھاگوان لکھتے لکھتے سو گیا۔''

آخری جملے میں اظہر جی کی پوری زندگی سمٹ آئی ہے۔

قاضی جاوید، نجم الحسن رضوی، سلطان احمد علوی، کیول دھیر اور نذیر فتح پوری کے مضامین بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ان سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی تحسین نہ کرنا ناانصافی ہوگی.....

''اظہر جاوید نمبر'' میں احباب کے منظوم نذرانے بھی شاملِ اشاعت ہیں۔ ان میں ہمیں مشکور حسین یاد، اقبال گرامی، یونس جاوید، صفدر سیال، وصی شاہ، رشیدہ عیاں، حمیرا راحت کا اظہارِ محبت اچھا لگا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سونان اظہر جاوید نے اپنے والدِ گرامی کے شایانِ شان ''اظہر جاوید نمبر'' شائع کیا۔ اُمید ہے کہ وہ معمول کے ''تخلیق'' کا معیار بھی برقرار رکھیں گے۔

◆◆◆

خط اُس کے کئے واپس اور اشک بچا لائے
اِک بوجھ اُتارا تھا، اِک بوجھ اُٹھا لائے

(اظہر جاوید)

لطیف قریشی

حضرت سچل سرمست

عشق عطا الٰہی ملدا
ناہیں کسب کماون دا

عشق ملے تو شوق چراوے
سولی رقص دکھاون دا

عشق لگے تے لطف اُٹھاوے
اُلٹی کھل لہاون دا

مہینوال نوں راز بتاوے
ران کباب بناون دا

سوہنی وچ تھلاں دے پایا
منزل عشق لگاون دا

رُکھی سُکھی کھا فقیرا
نہ کر جھیڑا لاون دا

OOO

مُنزّہ شاہد

کُونج

کِدھر گئیاں ساریاں ڈاراں، رہ گئی کونج اکلّی
کون شکاری؟ کِتھے لُکیا؟ سوچے جھل ولّی
کیتا کتریا سانبھ کے رکھ لے، بنھ لے گنڈھری اپنی
فیر نئیں مہلت مِلنی تینوں، کھڑکنی اے جد ٹلّی
مار وتھل دیاں تتیاں ریتاں لُوسن تن من میرا
وچ کراہی ہولی ہولی بُجھدی اے جیوں چھلی
سل ہجر دا، کنڈے، وٹے، سُولاں، نیزے، تیر
یار اسانوں پرکھن لئی کیہ کیہ سوغات نہ گھلّی
تیرے اگّے سی نئیں کرنی مار تُوں گجھیاں ماراں
بھورا ترس نہ کھاویں سوہنا! پُوری کر تسلی
لائیاں توڑ نبھاون دا اقرار جو کر بیٹھی ساں
لکھ ہنیریاں جُھلیاں سجنا! میں نئیں تھاں توں ہلّی
کِکر لوکاں کر چھڈیاں نیں ساڈے تن دیاں لیراں
لیر لیر پئی ناں تیرا جپدی، آکھیں متے نگلی
کوکاں تے کرلاٹاں پہنچن عرش معلیٰ تیکر
پَھٹ جگر دے رِسدے رہندے اُٹھے پیڑ اولی
لُوں لُوں رَچیا رانجھن ماہی ہور دی جا نہ کوئی
ڈولی دے وچ پاء کے لے گئے کھیڑے ملّو ملّی
بند گلی دے وچ کھلو کے کیہ سوچاں پئی سوچیں
کھیڑے تیرے مغر و مغری، جاناں کدھر ٹلّی
وانگ شدنیاں لبھدی پھر دی اپنا یار گواچا
اندر جھات نہ ماری، رانجھا بیٹھا اندر ملّی
کون آں میں کُجھ سمجھ نہ آوے تو ئیوں دَس دے سائیاں
میں منزّہ؟ جندے؟ ہیر؟ یا مولا دی جھلّی

سوالنامے کے جوابات

انور سدید

O سونان اظہر جاوید: ''تخلیق'' کے مدیر اظہر جاوید سے آپ کی پہلی ملاقات کب ہوئی؟ اس ملاقات کے تاثرات لکھیئے۔

☆ **انور سدید:** ''اظہر جاوید سرگودھا کے ایک نواحی قصبہ بھاگٹانوالہ کے رہنے والے تھے اور میں سرگودھا شہر کا آبادکار تھا۔ 1944ء میں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں کالج کی تعلیم کیلئے سرگودھا چھوڑ کر لاہور آ گیا اور اس کے بعد پاؤں میں ایسا چکر پڑا کہ 1964ء تک مجھے اس شہر میں زیادہ قیام کا موقعہ نہ ملا۔ اس عرصے میں ہی اظہر جاوید سرگودھا آئے، انہوں نے شاعرِ شباب جناب الطاف مشہدی اور ممتاز الشعراء جوہر نظامی کے آگے زانوئے تلمّذ تہہ کیا۔ لاہور کے اخبارات میں نامہ نگاری اختیار کی اور ''خلوص سرگودھا'' کی ادارت کی۔ ان حوالوں سے اظہر جاوید کا نام میرے لئے اجنبی نہ رہا، سرگودھا میں میرا ''جوگی والا پھیرا'' ہوتا تو انور گوئندی مدیر ''کامران''، عبدالرشید اشک مدیر ''شعلہ'' اخگر سرحدی مدیر ''نظام نو'' اور نئے ابھرتے ہوئے صحافیوں اثر چوہان، عاشق حسین جعفری، عمر دراز خان، ارشد بھٹی، یوسف گوئندی، تاج الدّین حقیقت سے ان کا نام اور ان کے صحافتی کارناموں کے بارے میں سنتا۔ چنانچہ ان سے غائبانہ تعلق پیدا ہوتا گیا۔ ان سے قریبی تعلق اس وقت پیدا ہوا جب انہوں نے سرکاری ڈیکلریشن حاصل کیے بغیر لاہور سے کتابی سلسلہ نظم ونثر ''تخلیق'' کے نام سے شروع کیا۔ لیکن یہ تعلق بھی غائبانہ تھا۔ کیوں کہ انہوں نے ''تخلیق'' کا آغاز کیا تو میں سیالکوٹ کے قریب ''مرالہ راوی لنک کینال'' کی تعمیر پر متعین تھا۔ اور اظہر جاوید لاہور میں تھے۔

O ''تخلیق'' میں آپ کی پہلی ''تخلیق'' کب شائع ہوئی، اس ادب پارے کا عنوان لکھیے اور غزل ہے تو مطلع لکھیئے''۔

☆ عجیب بات ہے کہ ''تخلیق'' سے میرا پہلا تعلق ناخوشگوار حالات میں ہوا۔ ان دنوں میرے ایک دوست غلام حسین راز گجراتی نے جو استاد امام دین گجراتی کے مدمقابل محمد حسین شوقؔ کے چھوٹے بھائی تھے، قادر آباد میں آموں کا

باغ لگایا تھا اور اپنے آموں کو ''غالب پسند آم'' کا عنوان دیا تھا۔ مجھے انہوں نے یہ تحفہ بھیجا تو ہر چند مجھے شاعری کا دعویٰ نہیں تھا، میں نے ''غالب پسند آم'' کا ''قصیدہ'' لکھا جو مولانا اخگر سرحدی کے رسالہ ''نظام نو'' سرگودھا میں چھپا۔ ان دنوں ''شعلہ'' کے مدیر عبدالرشید اشک اور مولانا اخگر سرحدی کے درمیان ''روح الامین'' اور ''روح امین'' کے مسئلہ پر ایک ادبی جنگ چھڑی ہوئی تھی۔ میری نظم ''نظامِ نو'' میں چھپی تو عبدالرشید اشک نے اپنے اخبار ''شعلہ'' میں اس کے پرخچے اڑا دیئے۔ اظہر جاوید ان دنوں عبدالرشید اشک کے طرف دار تھے جو الطاف مشہدی صاحب کے شاگرد تھے۔ گویا دونوں ''استاد بھائی'' تھے۔ اظہر جاوید نے عبدالرشید اشک کا ''تنقیص نامہ'' ..... ''تخلیق'' میں شائع کر دیا۔ چنانچہ وہ بات جو پہلے سرگودھا تک محدود تھی اب پورے لاہور بلکہ پورے ملک میں پھیل گئی۔ ادبی زندگی کے اس دور میں 1949ء تک میں رسالہ ''بیسویں صدی'' سے ترقی کر کے ''ہمایوں''، ''نیرنگ خیال''، ''چمنستان'' اور ''مشہور'' جیسے رسائل میں افسانے لکھ رہا تھا جن کی تحسین ماہر القادری، جمیل الدین عالی اور صادق الخیری جیسے ادیبوں نے کی تھی۔ اس لیے میرے دل میں ''شہرت یافتہ'' ہونے کا گمان بھی تھا۔ اگرچہ میں اس دور میں انجینئرنگ کی پیشہ ورانہ مصروفیت میں افسانہ لکھنا چھوڑ چکا تھا لیکن انور گوئندی صاحب نے میرے پرانے افسانے اپنے رسالہ ''کامران'' میں چھاپنے کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ اور انہوں نے مجھے ادب کی دنیا سے غیر حاضر نہیں ہونے دیا۔ انور گوئندی مجھے الطاف مشہدی کے پاس لے گئے اور اظہر جاوید کی شکایت کی کہ اس نے عبدالرشید اشک کی طرفداری میں انور سدید کے خلاف لکھا گیا مضمون شائع کیا ہے۔ الطاف مشہدی نے مشورہ دیا کہ اس مضمون کا جواب نہ دیا جائے۔ لیکن اظہر جاوید کو ان کے حوالے سے وہ ایک خط لکھ دیں گے۔ یہ میرا اظہر جاوید سے پہلا باضابطہ تعارف تھا۔ ان کا محبت بھرا جواب مجھے سیالکوٹ میں ملا جس میں عبد الرشید اشک صاحب کی بات کو آگے نہ بڑھانے کا وعدہ اس شرط پر کیا گیا تھا کہ میں ''تخلیق'' کیلئے کوئی نئی چیز لکھوں اور یہ سلسلہ شروع ہوا تو پھر پھیلتا اور بڑھتا ہی چلا گیا۔ اس دور میں جو چیزیں ''تخلیق'' میں چھپیں، ان کا ریکارڈ اب محفوظ نہیں۔''

O ''آپ کی تخلیقات کب تک اس پرچے میں چھپتی رہی ہیں؟''

☆ ''1964ء میں میری تعیناتی سرگودھا میں ہوئی اور ڈاکٹر وزیر آغا سے ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھا تو وہ مجھے ادب کی طرف واپس لے آئے اور مجھے اپنے مطالعے کی اساس پر تنقید لکھنے کا مشورہ دیا۔ انہیں دنوں ''تخلیق'' کو ڈیکلریشن مل گیا تھا۔ اور یہ باقاعدہ پابندیٔ وقت کے ساتھ چھپنا شروع ہو گیا تھا۔ ''تخلیق'' کے ایک پرچے میں کسی ادیب کا ایک مضمون مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کے خطوط کے اسلوب میں چھپا۔ اس مضمون پر میں نے جو اختلافی نکات

اٹھائے اور وہ بھی غالبؔ کے خطوط کے اسلوب ہی میں لکھے۔ یہ اظہر جاوید صاحب کو اتنے پسند آئے کہ انہوں نے ''تخلیق'' میں ''غالب کے نئے خطوط'' کا سلسلہ شروع کر دیا جو کئی برسوں تک جاری رہا۔ انہیں دنوں میں نے ''غزل کے نئے چراغ'' کے عنوان سے جدید غزل نگاروں پر مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ اس سلسلے میں ریاض مجید، رشید قیصرانی، کیف انصاری، مرتضٰی برلاس، جوہر نظامی، شکیب جلالی، نصرت چودھری کے علاوہ کئی ایسے شعراء پر تجزیاتی مضامین پہلی دفعہ اظہر جاوید نے شائع کیے۔ میں 1980ء کے آخری سالوں میں دہلی کی یاترا کر کے واپس آیا تو اظہر جاوید نے سفر نامہ ''دلی دور نہیں'' لکھوایا اور ''تخلیق'' میں قسط وار شائع کیا۔ اس تمام عرصے میں اظہر جاوید سے تعلقات وسعت پذیر ہوتے گئے اور ان کی پذیرائی میری ادبی زندگی کا قیمتی اثاثہ بنتی گئی۔ دیگر متفرق مضامین کے علاوہ اظہر جاوید نے میری کتابیں بھی ''تخلیق'' میں قسط وار شائع کیں۔

O ''ان تخلیقات پر اظہر جاوید کے تاثرات لکھیئے؟''

☆ ''اظہر جاوید میرے مضامین پر اپنے رائے کا اظہار لکھ کر نہیں کرتے تھے۔ سرگودھا میں قیام کے دوران ''تخلیق'' کا نیا پرچہ آتا اور میں اس کی رسید ٹیلی فون پر دیتا تو میرے مضامین کی تحسین موزوں الفاظ میں ضرور کرتے اور جس شاعر کی غزل پر میرا مضمون چھپتا اس کے تاثرات سے بھی آگاہ کرتے۔ لیکن ان کا اصرار ہوتا کہ میں ''تخلیق'' کے مضامین پر ''انجمن خیال'' کیلئے خط ضرور لکھوں اور رائے کا اظہار کھل کر کروں۔ اب میں کہہ سکتا ہوں کہ اظہارِ رائے کی جتنی آزادی مجھے ''تخلیق'' میں حاصل تھی، وہ کسی اور ادبی رسالے میں حاصل نہیں ہوئی۔ اہم بات یہ ہے کہ اظہار کی یہ آزادی اظہر جاوید نے سب لکھنے والوں کو دے رکھی تھی۔ اس ضمن میں معروف ادیب ستار طاہر کا حوالہ ضروری ہے۔ ستار طاہر ''تخلیق'' میں شعور کی بے لگام رو میں ''فٹ نوٹس'' (Foot Notes) لکھا کرتے تھے۔ اور وہ اکثر تہذیب واقدار کے مدار سے نکل جاتے تھے۔ اظہر جاوید یہ ''فٹ نوٹس'' من وعن شائع کرتے اور میں ان کا جواب ''انجمن خیال'' میں لکھتا تو اسے بھی قطع وبرید کے بغیر چھاپ دیتے۔ میں نے ستار طاہر کے معیوب رویے کی کبھی شکایت نہیں کی۔ لیکن اظہر جاوید بتاتے کہ ستار طاہر کی انا کو ٹھوکر لگتی تو وہ خوب جز بز ہوتے۔ ایک مرتبہ ستار طاہر نے ڈاکٹر وزیر آغا کے دوستوں کے بارے میں ''فٹ نوٹس'' میں Mute Dogs کی اصطلاح استعمال کی۔ میں نے اس ''دشنام'' پر صرف یہ کہا:

''اے شیخ گفتگو تو شریفانہ چاہیے''

اور یہ بھی کہ جناب ستار طاہر کی انگریزی مشکوک ہے۔ اس جواب کے بعد اظہر جاوید نے ''فٹ نوٹس'' کا سلسلہ بند کر دیا۔ لیکن ستار طاہر کی عمر نے بھی وفا نہ کی۔ آخری عمر میں ستار طاہر رسالہ ''قومی ڈائجسٹ'' میں میرے رفیق کار

تھے۔اس وقت وہ بائیں بازو کے دوستوں کے ستائے ہوئے تھے اور مجیب الرحمان شامی جیسے دائیں بازو کے صحافی کے رسالے میں کام کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ایک دن ستار طاہر کہنے لگے کہ جب بائیں بازو کے دوستوں نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا تو صرف اظہر جاوید میرے کام آئے اور انہوں نے میرے گھر کا چولھا ٹھنڈا نہیں ہونے دیا۔اور دل کی یہ بات بھی بتا دی کہ ''میں اظہر جاوید کو ہمیشہ اکساتا کہ انور سدید کے خطوط نہ چھاپیں،لیکن انہوں نے میری بات کو کبھی قبول نہیں کیا۔'' اظہر جاوید کا مؤقف یہ تھا کہ ادبی مکالمہ چلتے رہنا چاہیے۔اور سلسلہ تکلّم کا بند نہیں ہونا چاہیے۔''

O ''اظہر جاوید سے آخری ملاقات کا حال لکھیے۔''

☆ اظہر جاوید سے آخری ملاقات 13 فروری کو جم خانہ کلب میں شاہد علی خان مدیر الحمراء کی اس تقریب میں ہوئی جو انہوں نے لندن سے آئے ہوئے ممتاز اقبالیاتی ادیب ڈاکٹر سعید اختر درانی کے اعزاز میں منعقد کی تھی۔میں لاٹھی ٹیکتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تو اظہر جاوید دوڑ کر آئے اور میرا بازو تھام لیا۔میں ان کے سہارے چل کر صوفے تک پہنچا۔پھر یوں ہوا کہ جو مہمان بھی کمرے میں داخل ہوتا وہ اسے میرے پاس ملاقات کے لئے لے آتے اور کوشش کرتے کہ میں دائیں ٹانگ کی تکلیف کی وجہ سے اپنی نشست پر بیٹھا رہوں۔تقریب کے بعد میں اپنی کرسی سے اٹھ کر اظہر جاوید کے پاس آ بیٹھا۔سلمٰی اعوان کیمرہ لے کر آ گئیں اور تصویریں بنانے لگیں اظہر جاوید نے کہا ''کڑیئے۔کیمرے وچ فلم وی ہے یا نہیں؟'' سلمٰی اعوان نے پوچھا ''آپ کو یہ کیا سوجھی ہے؟'' اظہر جاوید بولے ''بی بی! توں کدی وی اپنے کیمرے دی بنائی ہوئی تصویر مینوں نئیں دیتی''۔سلمٰی اعوان بولی ''آپ کی شکایت اب دور کر دوں گی'' لیکن اگلے روز اظہر جاوید دنیا سے ہی اٹھ گئے۔اب مجھے یاد آ رہا ہے کہ ڈاکٹر سعید اختر درانی کی بیگم انگے بھی ہمارے پاس آ بیٹھیں اور باتیں کرنے لگیں۔اظہر جاوید اٹھ کر گئے اور گلاب جامنوں کا ڈونگہ اٹھا لائے اور اپنے ہاتھ سے گلاب جامن ہماری پلیٹوں میں رکھنے لگے۔میں نے تنبیہ کی کہ ''بوڑھوں کو چینی سے پرہیز لازم ہے''۔اظہر جاوید نے کہا ''یہ شرط آج ہم تینوں پر لازم نہیں آتی''۔اور دو دو گلاب جامن میری اور مسز انگے درانی کی پلیٹ میں ڈال دیئے۔یہ تقریب شام چار سے سات بجے تک جاری رہی۔اس تقریب ملاقات میں اظہر جاوید معمول سے کہیں زیادہ ہشاش بشاش نظر آئے۔اس دوران وہ کمرے سے چلے گئے تو میں نے سمجھا کہ شاید واپس نہیں آئیں گے۔لیکن وہ مغرب کی نماز پڑھنے کیلئے گئے تھے اور تقریب کے آخر تک ہال میں موجود رہے۔مجھ سے پوچھا ''واپسی کا کیا انتظام ہے؟'' میں نے بتایا کہ مجھے انور محمود خالد صاحب کار میں ساتھ لائے ہیں اور وہی گھر لے جائیں گے'' تو مطمئن ہو گئے۔لیکن کیا پتہ تھا کہ یہ ان کے ساتھ آخری ملاقات ہے۔اگلی

صبح جان کاشمیری صاحب نے گوجرانوالہ سے فون پر اطلاع دی تو میں دل پکڑ کر بیٹھ گیا۔''

ع کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

O ''تخلیق'' کی بیالیس سالہ صحافتی زندگی پر تبصرہ کیجئے۔''

☆ ''میں ''تخلیق'' کو اردو ادب کا کامیاب ترین رسالہ شمار کرتا ہوں جس نے ان گنت نئے لکھنے والوں کے قلم کو اعتماد بخشا اور ان کے شعورِ تخلیق کو آراستہ کیا۔ اظہر جاوید کا ''تخلیق'' لکھنے والوں کا خاندان تھا۔ اور اس کا ادیب شہرت کے حصول میں ناکام نہ ہوتا۔ اظہر جاوید کی کشادہ نظری اور وسعت قلبی نے ''تخلیق'' کو پوری اردو دنیا کا محبوب جریدہ بنا دیا تھا۔ گروہ بندی کے دور میں اظہر جاوید نے ''تخلیق'' کی غیر جانبداری کو قائم رکھا اور احمد ندیم قاسمی صاحب کے ساتھ ڈاکٹر وزیر آغا کو بھی پوری اہمیت دی۔ اس کی سب سے بڑی عطا یہ ہے کہ اس نے اردو ادب کو بے شمار خواتین کو ادبی صلاحیت سے متعارف کرایا۔ دوسری طرف اظہر جاوید نے رسالہ ''تخلیق'' کو اپنی شہرت کا وسیلہ نہیں بنایا اور اپنی شاعری یا افسانہ ''تخلیق'' میں شائع نہیں کیا۔ مقبول اکیڈمی سے میری پہلی کتاب کی اشاعت بھی انہوں نے ہی کرائی تھی۔ اس کے بعد ملک مقبول احمد ہم دونوں کے گہرے دوست بلکہ بھائی بن گئے۔''

O ''اظہر جاوید کی صحافت پر آپ کی رائے کیا ہے؟''

☆ اظہر جاوید نے ''امروز'' جیسے باوقار اخبار میں لمبے عرصے تک صحافت کی خدمات انجام دیں، لیکن وہ خبروں کے شعبے کی طرف نہیں گئے اور فوقیت ادبی صفحے اور کالم نگاری کو دی۔ آزادیِ اظہار اور جمہوریت کی حمایت میں انہیں مارشل لاء کی سزا بھی بھگتنی پڑی لیکن وہ پرورشِ لوح وقلم کرتے رہے۔ اور اپنی خودی، خودداری اور انا کو شکستہ نہیں ہونے دیا۔ ''تخلیق'' ان کی رگِ حیات تھا۔ اسے اپنے آخری سانس تک زندہ رکھنے کا عہد کیا تھا اور وہ اس عہد پر پورے اترے۔ حق تعالیٰ ان کی مغفرت کرے۔ وہ یادگار زمانہ اور افتخار زمانہ شخص تھے۔ میری ادبی زندگی میں ''تخلیق'' نے ہمیشہ مثبت کردار ادا کیا اور میں اظہر جاوید کی دوستی پر جو بے غرض اور بے لوث تھی، فخر کرتا ہوں۔

.....

سرفراز سیّد

O **سونان اظہر جاوید:** ''تخلیق'' کے مدیر اظہر جاوید سے آپ کی پہلی ملاقات کب ہوئی؟ اس ملاقات کے تاثرات لکھیئے۔

☆ **سرفراز سیّد :** ''اظہر جاوید سے پہلی ملاقات غالباً 1966 میں ہوئی۔ میں اس وقت طالب علم تھا اور ایک وفد کے ساتھ افغانستان، ایران اور ترکی کے چھ ہفتے کے دورے سے واپس آ کر میں نے ایک سفر نامہ لکھا تھا۔ اظہر جاوید ان دنوں سیّارہ ڈائجسٹ میں کام کرتے تھے۔ ان سے پہلی ملاقات انہی دنوں ہوئی۔ سیّارہ ڈائجسٹ کا دفتر ان دنوں چیرنگ

کراس کے قریب واقع تھا۔ یہ ملاقات رسمی سی تھی، اظہر بھی نوجوان تھے۔ انہوں نے بڑی محبت کے ساتھ باتیں کیں۔

O ''تخلیق'' کے مدیر اظہر جاوید سے آپ کی ملاقات کب ہوئی۔ اس ملاقات کے تاثرات لکھیے۔

☆ ''عجیب سی بات ہے کہ میں نے بہت کچھ لکھا، بہت کچھ کہا۔ اظہر جاوید کے دفتر میں بھی ہر ہفتے کم از کم ایک بار چکر ضرور لگتا تھا۔ یہ سلسلہ ''تخلیق'' کی ابتدا سے اب تک اسی طرح جاری تھا مگر یہ کہ ''تخلیق'' میں میری بہت کم چیزیں شائع ہوئیں۔ اس کی وجہ شائد یہ ہو کہ 45 برس کی صحافت کے دوران میرے روزانہ کالم اتنی بڑی تعداد میں شائع ہوئے ہیں کہ کسی دوسری جگہ چھپنے کا خیال نہیں آیا۔ ایک نظم نما غزل اظہر جاوید نے دو بار شائع کی (پتہ نہیں کیوں؟)۔ اس کا مطلع ہے۔

با ادب تیری محفل میں آتے رہے ، ساری رسمیں وفا کی نبھاتے رہے
سرخ پھولوں سے مقتل سجاتے رہے، یونہی لٹتے رہے جاں لٹاتے رہے''

O ''آپ کی ''تخلیقات'' کب تک اس پرچے میں چھپتی رہی ہیں۔''

☆ ''آخری بار دو برس پہلے۔''

O ''ان تخلیقات پر اظہر جاوید کے تاثرات لکھیے۔''

☆ ''میری تخلیقات پر اظہر جاوید نے کبھی کوئی تاثر نہیں دیا۔ بس لے کر رکھ لیں اور چھاپ دیں۔ ویسے یہ بات اچھی ہی تھی۔ وہ کسی تخلیق پر کوئی تنقید کر دیتا تو میں نے کیا کر لینا تھا، البتہ ذہن پر بوجھ رہ جاتا.....مگر اس کا ایک تاثر میری ساری تخلیقات کے بارے میں تمام تاثرات پر حاوی تھا.....اس نے ایک بار ایک محفل میں میری عدم موجودگی میں کہا تھا کہ ''سرفراز سیّد میرا بہت پیارا بہت اچھا دوست ہے''.....اپنے دوست کی تو ہر بات اچھی لگتی ہے نا!''

O ''کیا آپ کی تخلیقات پر ''انجمنِ خیال'' میں لکھنے والوں نے بھی اظہارِ خیال کیا؟''

☆ ''انجمن خیال'' میں کچھ احباب نے یقیناً میری تخلیقات پر پسندیدگی کا اظہار بھی کیا مگر تخلیقات بہت کم تھیں اس لئے ان پر اظہار خیال بھی کم رہا۔''

O ''اظہر جاوید سے آخری ملاقات کا حال لکھیے۔''

☆ ''اظہر جاوید سے آخری ملاقات اس کی وفات سے صرف دو روز پہلے ہوئی۔ میں نے روزنامہ ''اوصاف'' میں اپنے کالم ''راوی نامہ'' میں تخلیق کے حوالے سے اس میں شائع ایک تحریر کا خلاصہ شائع کیا۔ یہ تحریر میڈیکل کے ایک طالب علم کے بارے میں تھی جس نے یتیمی اور غربت کے عالم میں میڈیکل کی تعلیم حاصل کی، وہ اپنے گاؤں میں ماں کو مبارکباد دینے گیا وہاں پر جٹ طیاروں.....'' یہ بہت دردناک قصہ ہے۔ اسے میں نے ''تخلیق'' کے حوالے سے چھاپا

اوراس کالم والا اخبار اظہر کو دینے کے لئے اس کے دفتر چلا گیا۔خوبصورت سوٹ،خوبصورت نکٹائی،خوش گوار موڈ، چند لطیفے، کچھ لوگوں کی تعریف، کچھ کی غیبت۔ میں نے کہا کہ اظہر جی! چاچا ایف ای چودھری 15 مارچ کو 103 سال کے ہو جائیں گے۔ ہر سال کی طرح ہم نے اکٹھے جا کر چاچا کو پھول پیش کرنے ہیں۔ مجھے کہنے لگا کہ دیکھو! پچھلے سال ہم دونوں کے پھول تم نے خریدے تھے،اس بار میں خریدوں گا!

مگر.....مگر.....میں نے 15 مارچ کو اکیلے نے پھول خریدے!

بہت سے واقعات ہیں۔ایک دلچسپ واقعہ، کہ ایک روز میں شام کے وقت اظہر کے دفتر گیا۔ میرے ساتھ گاڑی کا باریش بوڑھا ڈرائیور بھی تھا۔اظہر دفتر میں مغرب کی نماز پڑھ رہا تھا۔ میں نے ڈرائیور سے کہا کہ وہ دور کسی مسجد میں جانے کے بجائے وہیں دفتر میں ہی نماز پڑھ لے۔اظہر نے چند منٹوں میں نماز ختم کی اور وہ بابا نماز پڑھنے کے لئے آ گیا۔نماز سے پہلے اس نے کوئی لمبی دعا پڑھی۔ پھر نماز ادا کی۔ پھر انگلیوں پر دیر تک تسبیح کی۔اس کے بعد پھر دیر تک دعا پڑھی۔ یہ عمل نصف گھنٹے سے زیادہ میں مکمل ہوا۔دفتر میں چار پانچ حضرات بیٹھے تھے وہ اس دوران بالکل مہر بلب بیٹھے رہے۔ بابا نماز پڑھ کر باہر نکل گیا میں کچھ کہنا چاہتا تھا اظہر نے اشارہ کیا کہ کوئی بات نہیں، دفتر میں پھر ہنسی مذاق کی باتیں شروع ہو گئیں۔اگلے روز مغرب کی نماز سے کچھ دیر پہلے اظہر جاوید کا فون آیا'' کہنے لگا کہ یار تین چار لوگ بڑی دیر سے بیٹھے ہیں، میں نے بہت سا کام کرنا ہے، یہ لوگ اٹھ ہی نہیں رہے، یار وہ ذرا اپنے بابا ڈرائیور کو بھیج دو، یہاں آ کر نماز پڑھے، بے شک نماز اور بھی لمبی کر دے!''

O ''اظہر جاوید سے روابط کے دوران کوئی یادگار واقعہ؟''

☆ ''تخلیق کی 42 سالہ صحافتی زندگی پر رائے تو بہت طویل ہو جائے گی۔ میرے پاس بہت سے ادبی جریدے آتے ہیں۔ ان سب کا شکریہ البتہ یہ کہ تخلیق کا دائرہ اثر پاکستان کے اندر تو جو رہا ہے وہ تو ہے مگر باہر بھی، امریکہ،لندن، جرمنی، خاص طور پر بھارت میں ''تخلیق'' آسام اور مدراس تک جاتا تھا۔ میں نے حیدر آباد دکن میں کتابوں کی ایک دکان پر ''تخلیق'' کا تازہ شمارہ دیکھا۔ بہت خوش ہوا۔ دکاندار سے اس کے بارے میں پوچھا،اس نے بتایا کہ ہر ماہ باقاعدگی سے آتا،اور بِک بھی جاتا ہے۔ میں نے بتایا کہ اظہر جاوید کا دوست ہوں اور اس کے شہر لاہور سے ہی آیا ہوں۔اس نے بہت پر جوش آؤ بھگت کی اور اظہر جاوید کے نام سلام بھیجا۔ بھارت کے مشہور مزاح نویس مجتبیٰ حسین کے گھر گیا تو وہاں بھی ''تخلیق'' پڑا ہوا تھا۔اس رسالے نے کیسے کیسے لوگوں کو ایک خاندان کی شکل میں جمع کر رکھا تھا۔''

◆◆◆

انجمن خیال (خطوط)

عزیز گرامی سونان صاحب!

سلام مسنون۔ ''تخلیق'' کا اظہر جاوید نمبر' ملا تو میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ آپ نے اپنے والدِ گرامی سے جن کے ساتھ میں نے اپنی ادبی زندگی کے چالیس سال گزارے تھے۔ میری بالمشافہ ملاقات کرادی ہے۔ سرورق پر جو تصویر ہے اس میں ان کی چمکتی ہوئی زیرک آنکھیں میری طرف ہی دیکھ رہی ہیں۔ ایسا بامعنی، فکر انگیز اور متنوع نمبر چھاپنے پر مبارکباد۔ اہم بات ہے کہ ''نقوش'' کا محمد طفیل نمبر ان کی وفات کے تقریباً دو سال بعد چھپا۔ ''فنون'' کا احمد ندیم قاسمی نمبر قریباً پانچ سال بعد شائع ہوا۔ تاج سعید، پیام شاہجان پوری اور شبنم رومانی پر خاص نمبر شائع ہی نہیں ہوئے۔ آپ نے کمال کر دیا کہ صرف تین چار ماہ میں نئے مضامین لکھوا کر ساڑھے تین سو صفحات کا خاص نمبر پیش کر دیا اور اندازِ ادارت اتنا خوبصورت کہ جس کسی نے دیکھا داد دی۔ آپ کی تحسین کی اور اُمید باندھی کہ آپ اظہر جاوید کی اس یادگار کو زندہ رکھیں گے۔ قارئین آپ کے لیے دعا کرتے ہیں۔

اس پرچے میں بیشتر ادیبوں نے اپنے اس رنجیدہ اور غم زدہ تاثر کو پیش کیا ہے جو اُنھیں اظہر جاوید کی اچانک موت پر محسوس ہوا۔ یونس جاوید، صابر لودھی، قاضی جاوید، سلطان رشک اور جمیل آذر صاحب نے ان سے اپنی ملاقاتوں اور باتوں کا تذکرہ کیا ہے اور ان مضامین میں اظہر جاوید کی پوری شخصیت سما گئی ہے۔ مجھے سلطان احمد علوی اور ملک مقبول احمد کے مضامین سب سے اچھے لگے۔ علوی صاحب ان کے بچپن کے دوست تھے اور ملک مقبول احمد نے ان سے اپنی آخری ملاقات کا حال لکھا۔ گوپیوں کے حوالے سے خواتین کا باب بے حد دلچسپ لگا اور عنوان بھی خوب ہے۔ ترنجن.....

دعا ہے کہ خدا آپ کے حوصلوں کو بلند رکھے اور ''تخلیق'' کا مرکز قائم رہے کہ اس سے اظہر جاوید کی یاد تازہ ہوتی رہے گی اور ادب کی خدمت الگ..... میں آپ کی محنت کی داد دیتا ہوں..... آپ کو ''پرائڈ آف پرفارمنس'' ادارت کے آغاز میں ہی مل گیا ہے۔ یہ معجزہ ہے۔

والسلام

آپ کا مخلص.....انور سدید (لاہور) .....

محترم سونان اظہر!

عرصہ دس سال کے بعد ''تخلیق'' کو خط لکھ رہی ہوں جو ''تخلیق'' کے مزاج سے واقف تھے انہیں معلوم تھا، اس میں چھپنے کے لیے محض اپنی تخلیقات ہی نہیں، ایڈیٹر کے نام خط لکھنا بھی ضروری ہوتا تھا، جو پرانی ادبی روایت کے طور پر اظہر جاوید نبھا رہے تھے۔ مگر میں، تخلیق میں مسلسل چھپ رہی تھی اور یہ ضروری رسم گول کیے جا رہی تھی۔ ہر دفعہ اظہر صاحب میری چیز وصول کرنے کے بعد فون پر اطلاع دیتے اور آخر میں اپنے مخصوص لہجے میں ہنستے ہوئے کہتے، ''بی بی۔ اس مرتبہ بھی آپ نے ایڈیٹر ''تخلیق'' کو گھاس نہیں ڈالی۔'' میں ہمیشہ کی لاپرواہ، خصوصاً ان لوگوں کے معاملے میں، جن پر یہ اعتماد ہو کہ، یہ زندگی کے ہر سرد گرم میں ساتھ رہیں گے۔ لہٰذا جواب میں کہتی۔

''یہ ضروری تو نہیں، اظہر صاحب! فون پر بات ہو رہی ہے، آپ اسے خط سمجھ لیں۔''

آپ ''تخلیق'' کی ایک پرانی روایت مسلسل توڑے جا رہی ہیں۔''

''مگر میں روایت شکن کے طور پر اپنی پہچان بھی تو بنا رہی ہوں۔'' میں ہنستے ہنستے جواب دیتی!

پہلے تو یہ سلسلہ چلتا رہا، مگر دو سال قبل، ایڈیٹر تخلیق نے میری نظم روک لی۔ کیوں؟ تین ماہ کے انتظار کے بعد میں نے پوچھا۔

''بی بی! آپ ایڈیٹر کو دو سطریں لکھنے کی زحمت گوارہ کر لیں۔ نظم چھپ جائے گی؟

''کیا یہ شرط ہے؟''

''یہی سمجھیں'' انہوں نے فون بند کر دیا۔ میں نے بھی ضد پکڑ لی اور انہوں نے بھی۔ ایک دفعہ پوچھا ''کہانی بھجوانا چاہتی ہوں۔'' جواب دیا ''ضرور، مگر شرط مت بھولیے گا۔'' میں نے کہانی کہیں اور بھجوا دی۔ ''تخلیق'' کے بااصول ایڈیٹر نے ''بھائی چارہ اپنی جگہ مگر اُصولوں پر سمجھوتہ نہیں ہوگا'' کی روایت قائم رکھی۔

یہاں تک کہ وہ دن آ گیا، جب ہم سب نے انہیں، اپنے ہاتھوں سے اللہ کے سپرد کر دیا۔ وہ نظم اب بھی ان کے کاغذوں میں کہیں رکھی ہوگی۔ عرصہ دس سال کے بعد ایڈیٹر کو خط لکھتے ہوئے سوچ رہی ہوں یہ کام پہلے کیوں نہ کر لیا؟

اللہ آپ کو سلامت رکھے، اپنے والد کی وراثت سنبھال کر، آپ نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس معاشرے میں آج بھی ایسے بیٹے موجود ہیں، جو زمینوں، جائیدادوں اور جائز ناجائز طریقے سے کمائی دولت کو نہیں، اصل وراثت، ان محبتوں، اصولوں اور وضع داریوں کو سمجھتے ہیں، جو ان کے والدین کی اصل کمائی ہوتی ہے۔ ''تخلیق'' اظہر جاوید کا Passion تھا۔ جسے سنبھال کر آپ نے ''تخلیق'' کے خاندان کو اپنا گرویدہ کر لیا ہے، اور دنیا پر یہ ثابت کیا ہے کہ اظہر جاوید وجودی طور پر ہمارے درمیان سے اُٹھ گئے ہیں، مگر ان کا ہنر باقی ہے اور ہنر ہی زندہ رہتا ہے، انسان مر جاتا ہے۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔

بشریٰ اعجاز (لاہور)

.....

پیارے سونان اظہر جاوید!

25 مئی کا مرسلہ خط 10/جون کو ملا، یاد آوری کا شکریہ۔ ساتھ ہی آپ کا مرتب کردہ اظہر جاوید نمبر بھی 'تخلیق' کے پہلے جنم سے کہیں زیادہ چمک دمک اور آن بان کے ساتھ ملا، دوبارہ شکریہ!

کیا کوئی بڑے سے بڑا نقاد، ادیب وصحافت کہہ سکتا ہے کہ 'اظہر جاوید نمبر' بساطِ ادب وصحافت میں قدم رکھنے والے کسی ہونہار صحافی کا یہ اوّلیں قدم اور پہلا کارنامہ ہے۔ ماشاءاللہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق اگر میرے دوست اچانک رحلت سے کچھ کام اُدھورے چھوڑ گئے تھے تو ''پدر شورند پسر تمام کند'' تم نے بطریقِ احسن پورے کرنے کا عزم وارادہ کیا ہے۔ تمہارے ''اظہر جاوید نمبر'' کو بحیثیت صوری اور معنوی دیکھ کر مرحوم ''نقوش'' اور ''فنون'' کی یاد تازہ ہوگئی۔ اپنی پہلی کاوش کے لئے قرار وتحسین کے مستحق ہو، اللہ مزید ہمت وحوصلہ دے۔ تمہیں اور پسماندگان کو جو گہرا زخم لگا ہے اس کے مندمل ہونے میں وقت لگے گا۔

پرچے کو دیکھ کر لگتا ہے مرحوم اظہر جاوید نے نیا جنم لیا ہے یا ''تخلیق'' نے بیالیس سالہ پرانا چولا اُتار کر نیا اور نفیس لباس زیب تن کر لیا ہو۔ مصوری اور خطاطی رنگ وآہنگ کا دلچسپ کھیل ہے۔ جہاں تک اظہر جاوید نمبر کے سرورق کا تعلق ہے محترمہ مصورہ سلیمہ ہاشمی صاحبہ نے رنگا رنگ گل بوٹوں سے سجا سنوار کر سرورق کو دلکش اور نظر نواز بنانے کی بجائے بڑی سادگی اور پرکاری سے نمبر کے موضوع کی مناسبت سے امن وسلامتی کے آسمانی اور نشو ونما زندگی کے سبز رنگوں سے اجتناب برتا ہے۔ خونی اور ماتمی سرخ وسیاہ رنگوں کا استعمال کر کے مصورانہ چابک دستی کا ثبوت دیا ہے۔ لفظ ''تخلیق'' کے نیچے سیاہ دھاگوں کا اُلجھا ہوا گچھا عناصر زندگی کے تانے بانے کے منتشر ہو جانے کو بڑی مہارت اور باریک بینی سے پیش کرتا ہے، ساتھ ہی رجائی مصورہ نے حزن وملال اور مایوسی کے تاثر کو کم کرنے کے لئے جناب اظہر جاوید کی ہنستی مسکراتی، زندگی سے بھرپور ایک نایاب تصویر سے مزّین کیا ہے۔

اظہر جاوید ہماری نظروں سے اوجھل ضرور ہوئے ہیں لیکن زندہ سلامت ہیں، جب تک ''تخلیق'' اور ان کی ادبی تخلیقی پونجی باقی ہے وہ زندہ رہیں گے۔ بلّھے شاہ اساں مرنا ناہیں! گور پیا کوئی ہور.....

عزیز میرٹھی (لاہور)

.....

محترم سونان اظہر جاوید صاحب!

دُکھ کی ایک عجیب کیفیت نے 14 فروری کو دل ودماغ سُن کر دیا کہ اسی دن مجھے ''تخلیق'' موصول ہوا اور اُسی دن اظہر جاوید کی رحلت کی خبر آئی۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کس سے اپنا دکھ شیئر کروں اور کسے پُرسہ دوں۔ کئی بار سوچا ڈاکٹر انور سدید کو فون کروں لیکن ہمت نہ ہوئی۔ صائمہ نورین بخاری، دردانہ نوشین خان، نیلم احمد بشیر اور دیگر کئی لکھنے والوں سے SMS کا تبادلہ ہوا۔ سب ہی اسی دُکھ اور کیفیت کا شکار تھے۔ ڈاکٹر انور سدید اور جان کاشمیری صاحب سے کچھ عرصہ گزرنے کے بعد ہمت

کر کے کرفون پر بات کی اورانہوں نے بتایا کہ اب ''تخلیق'' آپ شائع کریں گے۔

یہ دردِ مشترک ہے اسی لیے اظہر جاوید نمبر میں ڈاکٹر انور سدید، بانو آپا، بشریٰ رحمٰن، سیما پیروز، عذرا اصغر، ڈاکٹر سلیم اختر، سید مشکور حسین یاد، سلمیٰ اعوان، تسنیم منٹو، صائمہ نورین بخاری سے لے کر نیّر جہاں، نارنگ ساقی، کشمیری لال ذاکر، کیول دھیر، کلدیپ راج جوشی، نذیر فتح پوری سمیت سبھی ملکی اور غیر ملکی مصنفین کی یادداشتیں اور نگارشات خراجِ تحسین کا جامہ پہنے لفظ لفظ، سطر سطر، ورق ورق اشکوں سے لبریز، دل کو چیر دینے والی خونِ دل سے لکھی وہ تحریریں ہیں جنہوں نے اظہر جاوید کو زندہ جاوید بنانے کے ساتھ ساتھ ان کی حیات سے موت تک کے لمحات کو سبھی کی نگاہوں میں متحرک کر دیا۔ اب تو یہی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ نقشِ اظہر جاوید یعنی سونان اظہر کو ہمت واستقامت عطا فرمائے اور اللہ تعالیٰ اظہر جاوید کے درجات بلند فرمائے۔ انہیں ہمسایہ جبریل امیں بنائے آمین ثم آمین!

نیر رانی شفق (ڈیرہ غازی خان) .....

محترمی سونان اظہر جاوید!

تخلیق کا اظہر جاوید شمارہ اپنی جملہ رعنائیوں اور دلچسپیوں سمیت وارد ہوا۔ اس کی غایتیں اور نیابتیں دل کو لگیں۔ مضامین شعرونثر کی تفصیلی غایت خوش عنوان ہے ''اظہر نما'' ہے۔ اظہر جاوید کے لیے دلی خلوص کی شدتیں نہایت ''اثر برپا'' ہیں۔ برسوں سے ''تخلیق'' سے میری رہ ورسم ہے۔ بہرطور اظہر جاوید مرحوم کی روح بہت خوش ہوگی کہ ان کے بیٹے سونان اظہر نے ان کی جگہ بصدِ زیب وزینت سنبھال لی ہے۔ اظہر جاوید سے شومئی قسمت میری ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ ''اپنی بات'' کی انگیخت وانگیز سے میں نے انہیں پایا ہے۔ ان کے سانحۂ ارتحال کا المیہ دل میں تیر کی طرح ترازو ہے۔ اپنا بھی وقت قریب ہے ہوش وحواس بجا نہیں ہیں۔

ع ہم بھی تو جانے والے ہیں سامان تو گیا

آصف ثاقب (بوئی۔ ہزارہ) .....

عزیزم سونان اظہر!

''اظہر جاوید نمبر'' موصول ہوا۔ تمہارے لئے دل سے بے شمار دعائیں نکلیں۔ بے شک تم نے اپنے والد کے شایانِ شان نمبر نکال کر ایک سعادت منداور محبت کرنے والے بیٹے کا حق ادا کر دیا ہے۔ شاباش.....ایک سے ایک مضمون اور منظوم حصہ بڑھ کر تھا۔ عجیب بات ہے۔ ہر مضمون پڑھنے کے بعد میں نئے سرے سے اُداس ہو جاتی تھی۔ اور رسالہ ہاتھ سے رکھ دیتی تھی۔ تاثرات اتنے جاندار اور اثر انگیز تھے کہ ایک ہی بار سارے مضامین کو پڑھ لینے کا حوصلہ نہیں ہو رہا تھا۔

اس سے مجھے اندازہ ہؤا کہ اظہر جاوید دوستی، کارکردگی اور محبتوں میں کس قدر بھرپور اور بے انتہا تھے۔ ایسے لوگ مرنہیں سکتے ہمیشہ زندہ رہتے ہیں۔ ''تخلیق'' نکلتا رہا تو اظہر جاوید موجود رہیں گے۔ ان کی روح خوش ہوگی۔ تمہیں اس کا اجر کثیر ملتا رہے گا۔ والدین کے جانے کے بعد ان کے مشن کو جاری رکھنے کا بھی ویسا ہی اجر ملتا ہے جو ان کی زندگی میں ملنا ہو۔

میری دعا ہے۔ تم صحت وسلامتی کے ساتھ یہ کام جاری رکھو۔ اللہ تمہارا حامی وناصر ہو۔ میرا تعاون بھی ہر حال میں شامل رہے گا انشااللہ..... تمہارا اور سعدیہ کا مضمون بھی بہت اچھا تھا۔ سدا خوش رہو، آباد رہو!

بشریٰ رحمٰن (لاہور)

.....

پیارے بیٹے سونان!

میں 9 جون 2012ء صبح کی فلائٹ سے کراچی پہنچ گئی ہوں۔ آنے سے پہلے ''تخلیق'' مجھے مل گیا تھا۔ ان دو دنوں میں وقفے وقفے سے ''تخلیق'' پڑھتی رہی اور دل ہی دل میں تمہیں داد دیتی رہی۔ یقین نہیں آتا کہ یہ شمارہ تم نے مرتّب کیا ہے، یقیناً اظہر کی روح تمہارے ہم رکاب رہی ہوگی۔

''تخلیق'' ابھی پورا نہیں پڑھ پائی ہوں۔ جتنا پڑھا اس میں یادیں ہی یادیں ہیں سب کی اپنی اپنی۔ تمہارا مضمون بہت اچھا لگا۔ تم تو بیٹے! چھپے رستم نکلے۔ تحریر کے حوالے سے بھی اور دیگر معاملات کے حوالے سے بھی۔ ایک دن سوچ رہی تھی کہ تم سے کہوں ''بیٹا! گھر جلدی چلے جایا کرو۔'' خدشات نے دل میں سر اٹھایا تھا۔ عافیہ مقبول جہانگیر کا مضمون بھی مجھے بہت اچھا لگا۔ اس کے خمیر میں بھی ادب کے بیج دونوں طرف سے آئے ہیں۔

تم نے نئے شمارے کی تیاری کا اعلان کر دیا۔ میں ذاتی طور پر کچھ سست بھی واقع ہوئی ہوں اور ابھی لاہور سے آ کر اُداس بھی ہوں۔ اظہر کی باتیں اور یادیں تو اتنی ہیں کہ جلد ختم ہوں گی نہیں۔ بہرحال ان بہت سی یادوں میں ممی (تمہاری دادی) ہیں۔ بہت محبت کی وضع دار خاتون تھیں۔ مسرت ہیں، سلمونیہ ہے، ڈاکٹر نشاط ہیں۔ نشاط میری ڈاکٹر تھیں۔ اظہر کی ممانی بعد میں بنیں۔ ان کے حوالے سے بہت سی یادیں ہیں۔ مسرت (سلمونیہ کا میاں) پشاور سے عموماً اسلام آباد ہمارے گھر آتے تھے۔

اب وقت کہاں سے کہاں جا نکلا ہے۔ اس وقت کبھی تصور میں بھی نہیں آیا تھا کہ سب یوں بچھڑ جائیں گے۔ اصغر کو اپنی منزل پر پہنچے ابھی دو سال چھ مہینے اور بائیس دن ہو گئے ہیں اور میں آج تک حیرت کا شکار ہوں۔ وہ اچانک کیسے خاموش اور بے حس وحرکت ہو گئے تھے۔ بتانا صرف یہ تھا کہ تم نے بہت اچھا پرچہ ترتیب دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہیں توفیقات سے نوازے اور ''تخلیق'' جاری رہے۔ اظہر جاوید کا نام زندہ رہے، تم سے، سلمونیہ سے اور تخلیق سے۔

عذرا اصغر (کراچی)

.....

جناب سونان اظہر صاحب!

سب سے پہلے تو میں اپنے دوست اظہر جاوید صاحب کی بے وقت موت پر اظہار تعزیت کرنا چاہتا ہوں۔ مرحوم میرے بہت پرانے ملنے والوں میں سے تھے۔ میری ان کی رفاقت تقریباً روزنامہ ''امروز'' کے زمانے سے تھی۔ اگرچہ بہت زیادہ میل ملاپ یا دوستی کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا لیکن جب بھی ان سے ملاقات ہوتی وہ بڑے پیار سے ملتے اور خیر و عافیت دریافت کرتے۔ کئی بار وہ میرے آفس بھی تشریف لائے۔ ماہنامہ ''تخلیق'' مجھے عرصہ دراز سے اعزازی ملتا رہا جس کی وجہ سے میں ان کی علمی، ادبی سرگرمیوں سے آگاہ رہتا تھا۔ اظہر جاوید اب ہم میں نہیں ہیں دعا گو ہوں کہ اللہ تبارک تعالیٰ مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے اور پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین!

آغا امیر حسین (لاہور)

.....

محترمی سونان اظہر!

''تخلیق'' کا اظہر جاوید نمبر بہت دن سے زیرِ مطالعہ ہے۔ اسے آپ نے اظہر جاوید کے دوستوں اور اپنی کاوشوں اور صلاحیتوں سے بلا شک وشبہ ایک زندۂ جاوید نمبر بنا دیا ہے اور اتنے ضخیم شمارے کی اشاعت کے بعد یہ سوچ کر جی خوش ہوتا ہے کہ انشاءاللہ اب ''تخلیق'' کی مسلسل اور باقاعدہ اشاعت آپ کے لئے کوئی مسئلہ ہی نہیں ہوگی۔

آپ نے اظہر جاوید کے فن و شخصیت کے حوالے سے اس خصوصی نمبر میں مختلف عنوانات کے تحت جو مضامین اور منظومات شائع کی ہیں ان کے مطالعے کے بعد سچی بات تو یہ ہے مجھے یوں لگا کہ اظہر جاوید کو ہم نے اُس کی زندگی میں اس بھرپور طریقے سے دیکھا اور سمجھا ہی نہیں کہ اُس کی ہمہ جہت شخصیت کا ہمیں کچھ ادراک ہوسکتا۔ یہ پڑھ کر خوشی ہوئی اور مضمون لکھنے کا ارادہ مستحکم بھی ہوا کہ 2012ء کو ''سالِ اظہر جاوید'' کے طور پر منایا جائے گا۔ میرا خیال ہے اس سال کے بعد بھی ہر شمارے میں ان پر کوئی مضمون، کوئی نظم التزاماً شامل کیا کریں۔

ایک مشورہ کہ امریکہ میں مقیم سیّد ذہانت حسین کا بے حد عمدہ سفرنامہ جو قسطوں میں شائع ہو رہا تھا اُسے آئندہ شماروں میں شامل کیجیے۔ اُس میں اظہر جاوید نے جو کچھ لاہور میں اُن کے لئے کیا اُس کا بھی تفصیلی ذکر ہے اور اُسے ریکارڈ پر آنا چاہیے۔ ذہانت کی نثر بھی بے حد عمدہ اور شگفتہ ہے۔

مخلص..... نسیمِ سحر (راولپنڈی)

.....

محترم سونان اظہر جاوید!

آپ سے فون پر بات ہوئی۔ اللہ تعالیٰ محترم اظہر جاوید صاحب کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ اور آپ لوگوں کو صبر اور حوصلہ دے۔ (آمین)

میرا کلام نوّے کی دہائی میں ''تخلیق'' میں شائع ہوتا رہا ہے۔ پھر ایک طویل وقفہ آ گیا۔ 14/فروری کو اظہر جاوید صاحب کے انتقال کی دردناک خبر نے سکتہ سا طاری کر دیا۔ ادبی دنیا سوگوار ہوگئی۔ محترم اظہر جاوید صاحب کی ادبی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ پچھلے دنوں محترمہ عذرا اصغر صاحبہ کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ آپ ''تخلیق'' کے سلسلے کو آگے بڑھا رہے ہیں اور اس سلسلے میں بڑی محنت اور کوششوں سے ''اظہر جاوید نمبر'' نکال رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو زندگی، صحت، ہمت، اور حوصلہ عطا فرمائے اور آپ اپنے والد صاحب کے اس سلسلے کو آگے بڑھا سکیں۔

آپ کے والد صاحب کے انتقال سے جو نقصان ہوا ہے اس کی تلافی تو ممکن نہیں مگر اس طرح کم از کم آپ ادب کی آنکھ سے گرنے والے آنسوؤں کو ضرور پونچھ سکیں گے۔ ادب، ادبی دنیا اور اس میں بسنے والے ہمیشہ آپ لوگوں کے مقروض رہیں گے۔

فوقیہ مشتاق (امریکہ) .....

عزیز سونان اظہر جاوید!

میں سب سے پہلے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں اور آپ کے حوصلے کی داد دیتا ہوں کہ آپ نے اپنے عظیم والد کی یاد میں ''تخلیق'' کی خصوصی اشاعت ''اظہر جاوید نمبر'' کا اہتمام کیا اور اسے نہ صرف ملک کے گوشے گوشے میں بسنے والے بلکہ غیر ممالک میں رہائش پذیر اہلِ قلم کی یادگاری تحریروں اور مرحوم کی نایاب تصاویر سے مزین کیا۔ اس طرح ایک جامع، وقیع اور ضخیم دستاویز (لگ بھگ 400 صفحات پر مشتمل) مرتب ہوئی جو ایک طرف تو ہمارے عہد کے اس نابغۂ روزگار شاعر، ادیب، نقاد اور صحافی کی یاد کو دوام بخشے گی جبکہ دوسری طرف محققین اور جُویانِ علم کے لیے ایک معتبر حوالے (Reference) کا کام دے گی۔

نثری اور شعری دونوں قسم کی تخلیقات خوب سے خوب تر ہیں۔ سب ہی نے اپنے اپنے انداز میں مرحوم اظہر جاوید کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور بعض ان پہلوؤں کو سامنے لائے ہیں جو عام قارئین کے علم میں نہیں تھے چونکہ تمام کاوشیں خالص محبت، خلوص اور دلی وابستگی کے جذبات سے مملو ہیں اس لیے ان کے معیار پر تبصرہ کرنا محلِ نظر ہوگا۔ بس اتنا کہنا کافی ہے کہ

ع جو ذرّہ جس جگہ ہے، وہیں آفتاب ہے

مخلص.....ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی (کراچی) .....

محترم مدیر ''تخلیق''!

ماہنامہ ''تخلیق'' کے بے مثال ''خالق'' اظہر جاوید ماہ فروری 2012ء میں ہنستے کھیلتے اچانک اپنے دوستوں اور اپنے ''تخلیق'' کو داغِ مفارقت دے گئے تو حلقۂ ادب کے اکثر نجومیوں کا زائچہ یہ بتانے لگا کہ ''تخلیق'' کی آئندہ تخلیق اب ممکن نہیں رہی۔ اظہر جاوید جیسا کوئی اور جاں سپار ''تخلیق کار'' کہاں.....لیکن سونان نے اظہر جاوید کے دوستوں کے تعاون سے جون

2012ء میں ایک خوبصورت، یادگار، ضخیم اور معیاری اظہر جاوید نمبر شائع کر دکھایا۔

اظہر جاوید نمبر میں جہاں ادیبوں اور شاعروں سے ان کے ذاتی تعلقات کے بہت سے ان چھوئے گوشے پہلی مرتبہ بے نقاب ہوئے ہیں وہاں ان کی درونِ خانہ زندگی، سونان اور اسکی شریکِ حیات سعدیہ، بیٹی سلمونیہ، نواسوں اور پوتوں سے بے لوث اور بے غرض محبت کی کرنیں بھی اظہر جاوید کی یادوں کو منور کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ ان کرنوں کی چمک سعدیہ سونان کے مضمون ''دل کے نہاں خانوں سے'' اور سونان اظہر کے مضمون ''آخری دیدار'' میں دیکھی جا سکتی ہیں۔ باقی رہے خود اظہر جاوید، تو وہ اپنا کمالِ فن ایک مرتبہ پھر اپنی سابقہ تحریروں کے آئینے میں عکس ریز کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں اور اپنے قارئین کی آنکھوں کو نم کرتے چلے جاتے ہیں۔ اظہر جاوید ہر ماہ ''تخلیق'' میں ''اپنی بات'' کے عنوان سے ایک پُر اثر اداریہ تحریر کیا کرتے تھے۔ اداریے میں ان کا اسلوبِ قلم دلوں کو تسخیر کر لیتا تھا۔ زیرِ نظر خاص نمبر میں سونان نے پہلی مرتبہ 'پہلی بات' لکھی ہے اور اس میں اپنے دل کی ساری باتیں تحریر کر دی ہیں۔ اظہر جاوید کے لئے اگر اس کی ادبی اور تخلیقی خدمات 'پرائیڈ آف پرفارمنس' کا درجہ رکھتی تھیں تو اظہر جاوید نمبر سونان کے لیے زندگی بھر 'پرائیڈ آف پرفارمنس' کا حوالہ بنا رہے گا۔ خلوصِ دل سے دعا ہے کہ اللہ تبارک تعالیٰ سونان کو وہ ہمت اور استقامت بخشے جو اظہر جاوید پر چالیس سال سے زائد عرصہ کے لئے انعام کی گئی۔

.....

ظفر علی راجا (لاہور)

محترم مکرم سونان اظہر جاوید!

میرا حوصلہ ملاحظہ ہو کہ اتنی دیر ہو جانے کے باوجود بھی تعزیت نامہ ارسال کرنے کی ہمت کر رہا ہوں! الحمدللہ۔ چونکہ مرحوم و مغفور کی ذاتِ گرامی کے علاوہ دیگر اہلِ خانہ سے واقفیت اور شناسائی ہی نہ تھی کچھ یہی امر آڑے آیا! اب آپ کا معلوم ہوا تو یہ چند سطور لکھنے کی توفیق پا رہا ہوں۔

محترم اظہر جاوید صاحب، نوآموز لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کرتے تھے، آخر دم تک ادب کی خدمت کرتے کرتے اچانک رخصت ہو گئے۔ افسوس ہوا، رنج ہوا! خیر ہم سب نے جانا ہے۔ مولا کریم انہیں جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ ان کے درجات بلند فرمائے اور آپ سب کو صبرِ جمیل عطا فرمائے! آمین ثم آمین۔

.....

خیر اندیش..... طفیل عامر (انگلستان)

عزیزم سونان اظہر جاوید!

آپ سلامت رہیں! زہے نصیب کہ آپ نے بھی اظہر بھائی کی طرح مجھے ''تخلیق'' کے لائق سمجھا۔ ''تخلیق'' بھی ایسا جو اپنے خالق کی یادوں اور باتوں سے بھرپور ہے۔ بہت تو انا لائف البم۔ احباب کی تحریریں اور زندگی آموز حکایات..... آپ نے

خوب اس کا روپ نکھارا۔ خوش رہو، پروردگار مزید ہمت و استقامت دے کہ ''تخلیق'' اردو دنیا میں موجود رہے۔ پرچہ ارسال کرنے کا شکریہ!

طفیل اختر (لاہور)

.....

عزیزِ محترم سونان اظہر!

کچھ روز بیشتر میں اپنے برادرِ گرامی تاشی ظہیر صاحب کے گھر بیٹھا ہوا تھا۔ انہوں نے مجھے ''تخلیق'' کا اظہر جاوید نمبر دکھایا۔ میں نے اس کی ورق گردانی کی۔ ابھی تو ہم اُن کا غم بھی نہیں بُھلا پائے تھے کہ اس نمبر نے افسوس ناک یادیں تازہ کر دیں۔ میں ورق گردانی کرتا رہا اور میری آنکھوں سے آنسو بہتے رہے۔

اس عظیم انسان نے ''تخلیق'' کے ذریعے شعروادب کے پودے کی آبیاری کی جو بیالیس سال سے زیادہ کے عرصے پر منحصر ہے۔ اب یہ تن آور درخت آپ کی Custody میں ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمت وحوصلہ عطا کرے کہ آپ اس ذمہ داری کو احسن طریقہ سے سنبھال رکھیں۔

پہلی بار 1990ء کی دہائی میں میں ماہنامہ ''تخلیق'' کے دفتر بھگوان سٹریٹ پرانی انارکلی لاہور اپنے دیرینہ دوست حسین مجروح صاحب کی رفاقت میں اُن سے ملنے گیا تو میری بے حد خوش قسمتی اور سعادت کہ اس محفل میں سید واصف علی واصف، انور سدید، بابا محمد یحییٰ خاں سیاہ پوش، آپا بانو قدسیہ اور اشفاق احمد صاحب بھی موجود تھے۔ پنچائیت زوروں پر تھی۔ مجھے یاد ہے کہ اظہر بھائی نے زبردستی وہاں کی مشہور سوغات ''لاہوری فالودہ'' سے ہماری تواضع کی۔ خدائے بزرگ و برتر انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقامات عطا فرمائے اور آپ کو تادیر سلامت رکھے۔ آمین! پرسانِ حال کو سلام و نیاز۔

دُعا گو..... نصیر ہمایوں (امریکہ)

.....

عزیز القدر عزیز سونان اظہر!

آشیرواد ڈاکٹر کیول دھیر صاحب کی کوششوں سے ''تخلیق'' کا ''اظہر جاوید نمبر'' بصر نواز ہوا۔ سلیمہ ہاشمی صاحبہ کا سرورق دیکھتے ہی آنکھوں سے ٹپ ٹپ کرتے ہوئے اشک زمین پر گرنے لگے۔ اظہر بھائی کا ہنستا مسکراتا، کھلکھلاتا ہوا چہرا آنکھوں کے سامنے نمودار ہو گیا۔ اظہر بھائی کی یاد میں اس قدر خوبصورت اور دل کش نمبر نکالنے پر آپ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ جن جن اصحاب کی کاوشوں سے ایسا خوبصورت نمبر اشاعت پذیر ہوا ہے اُن سب کو داد و تحسین۔ آپ نے خاص طور پر فرضِ پسرائی ادا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ جیتے رہو۔ اپنے والدِ بزرگوار کی روشن کی گئی شمع کو جلائے رکھنے کا جو ارادہ اور منصوبہ آپ نے باندھا ہے ایشور آپ کو اُس میں کامیابی دے۔ گذشتہ سالوں کی طرح اگلا شمارہ ملتے ہی سالانہ چندہ بھائی نارنگ ساقی صاحب کے حوالے کر دوں گا۔ میری دُعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

کُلدیپ جوشی اِخلاص پوری (بھارت)

.....

پروفیسر آفاق صدیقی

''میرے بہت پیارے من میت قریب قریب پچاس برسوں کے سنگی ساتھی اظہر جاوید کے لیے اب سوائے اس کے اور میرے پاس کیا ہے کہ ۔

موتی کے دو تھال سجائے آج ہماری آنکھوں نے
تم جانے کس دیس سدھارے بھیجیں یہ سوغات کہاں؟

رہ رہ کر اس بہت پیارے دوست کی دائمی جدائی تڑپا رہی ہے۔ بسترِ علالت پر ہوں اور جو نقاہت پچھلے دو ماہ سے جسم و جاں کا آزار بنی ہوئی تھی وہ بہت بڑھ گئی ہے۔ ایک غم جو شدت سے محسوس کر رہا ہوں وہ یہ کہ پیارے اظہر جاوید نے اپنی جدائی سے پہلے بڑے خوشگوار موڈ میں فون پر عیادت کرتے ہوئے کہا ''آفاق بھائی! بھلا آپ بیمار کیسے پڑ گئے آپ کو تو میرے بارے میں کتاب لکھنی ہے۔'' آج اُس من موہنی آواز اور انتہائی خلوص میں ڈوبے ہوئے الفاظ کو یاد کر رہا ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے میری بھی روانگی کا وقت آ گیا ہے۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی کا یہ کہنا کہ ''جب میرے سامنے کسی شاعر کی شخصیت ہوتی ہے تو اس کو سمجھنے کے لیے میں سب سے پہلے جس چیز کی تلاش کرتا ہوں وہ شاعر کے اندر انسان کی تلاش ہوتی ہے۔''

اس قول سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اظہر جاوید ایک اچھے انسان تھے۔ انسانیت کی جو قدریں ان کے بطون میں پائی جاتی تھیں، اس کا اظہار گاہے بہ گاہے ان کی گفتار اور کردار سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

(پروفیسر آفاق صدیقی وفات پا گئے ہیں۔ یہ ان کی آخری تحریر ہے.....سونان کے نام)

آفاق صدیقی (کراچی)

.....

پیارے سونان اظہر جاوید!

''تخلیق'' کا اظہر جاوید نمبر بلاشبہ ٹائٹل سے ٹیل تک ایک محبت کرنے والے بیٹے کے جذبات اور اظہر جاوید سے پیار کرنے والے دوستوں کی محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ عقیدت اور اعتراف کا یہ گلدستہ معنی کے لحاظ سے پروڈکشن کے لحاظ سے اور مجموعی طور پر حاضری کے اعتبار سے اظہر جی کے شایانِ شان ہے۔ بازوؤں کی توانائی کو بحال اور رگوں میں لہو کو جو یقیناً اظہر جاوید کی یاد دلاتا ہے، اللہ تعالیٰ رواں دواں رکھے۔

بیدار سرمدی (لاہور)

.....

محترم! نامور ادیب اور شدّتِ احساس پر مبنی اشعار کو ''تخلیق'' دینے والے مرحوم اظہر جاوید کے بارے میں مختصر انداز میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ عالِم کی موت عالَم کی موت کے مترادف ہے۔ اُنھوں نے ''ادب شناسی'' کے وہ جوہر دکھائے ہیں کہ اُن

کے ناقدین بھی اُن کی عظمت کے معترف دکھائی دیتے ہیں۔ وہ اِس بات کے دل سے قائل تھے کہ ''شہرِ ذات'' کے سارے دروازے اندر کی طرف کھلتے ہیں باہر کی طرف کوئی راستہ نہیں ہوتا۔ جاں گُسل مراحل طے کرنے کے بعد اُنھوں نے ایک طویل عرصہ تک ادب کی آبیاری کرتے ہوئے ماہنامہ ''تخلیق'' کو جاری رکھنے میں اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو جاری رکھا اور عزمِ صمیم کے ساتھ قلب ونظر کی ساری توانائیاں اس میں صَرف کرتے ہوئے کوئی بھی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ اس سلسلہ میں توقع رکھتا ہوں کہ اُن کا یہ ''چراغ'' آئندہ بھی فروزاں رہے گا۔

''حق مغفرت کرے کہ عجب آزاد مرد تھا''

مقصود بٹ (لاہور)

.....

جناب محترم سونان اظہر جاوید صاحب!

السلام علیکم! ''تخلیق'' کا اظہر جاوید نمبر آپ کی ان تھک محنت، ثابت قدمی اور تمام تخلیق کاروں کی بے پناہ محبت و عقیدت سے ایک یادگار نمبر کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ جناب عادل حسن نے ایک نہایت خوبصورت جملے میں طویل بات سمیٹی ہے کہ ''اظہر جاوید صاحب آپ ''تخلیق'' میں امر ہوگئے ہیں جو امر ہو جاتا ہے وہ مرا نہیں کرتا۔''

جناب اظہر جاوید صاحب ہمارے دلوں میں زندہ ہیں اور ''تخلیق'' میں امر ہوگئے ہیں اور انشاءاللہ ''تخلیق'' آپ کی اور آپ کی ٹیم ڈاکٹر انور سدید صاحب اور دیگر کی باہم کوششوں سے جاری وساری رہے گا کیونکہ روشنی، محبت، خوشبو کا سفر کبھی تھمتا نہیں۔ یہ ''تخلیق'' کی صورت میں ہر دم رواں رہتا ہے۔ دعاؤں کے ساتھ

صائمہ نورین بخاری (ملتان)

.....

عزیزِ محترم سونان صاحب!

دُعائیں! آپ کا خط ملا۔ خدا ہر ایک کو نیک اولاد عطا کرے آمین! آپ نے اپنے والد مرحوم کا مشن جاری رکھنے کا قصد کیا ہے۔ اللہ آپ کو کامیاب کرے اور آپ کے ارادوں میں برکت دے۔ مرحوم اظہر جاوید سے راقم کی شناسائی 67ء سے شروع ہوئی اور اُن کے دمِ واپسیں تک قائم رہی۔ اُن کے مدیرانہ معیار کو برقرار رکھنا انتہائی کٹھن کام ہے کیونکہ یہ شہادت گہہ اُلفت میں قدم رکھنا ہے۔ خدا آپ کا حامی وناصر ہو۔

آپ کا مخلص

غلام نبی اعوان (راولپنڈی)

◆◆◆

لاثانی
www.lasanipharma.com
نام بھی لاثانی معیار بھی لاثانی
لاثانی کا
عرق مہزل
وزن گھٹائیں
صحت پائیں
نوٹ
خریدتے وقت بوتل پر جدید پلاسٹک لیبل، معلوماتی لٹریچر اور لاثانی کی کوالٹی سیل ضرور دیکھ لیں۔
ہر قسم کے موٹاپے کی وجوہات کو کم کرنے کیلئے مؤثر دوا
No Side Effect
ARQ-E-MEHZAL
Herbal Product
No Side Effects
اپنی صحت کے مسائل کے حل کیلئے
بعذریعہ خط یا ای میل لاثانی فارما کے
ماہرین سے طبی مشورہ لے سکتے ہیں۔
ایڈریس برائے رابطہ:
شعبہ ریسرچ اینڈ ڈویلپمنٹ (R&D) لاثانی فارما
ای میل: info@lasanipharma.com
تمام دوائیں بچوں کی پہنچ سے دور رکھیں۔ طبیعت زیادہ خراب ہو تو معالج سے رجوع کریں۔
لاثانی فارما پرائیویٹ لمیٹڈ
مناوا باٹاپور لاہور، پاکستان
فون 042-36581200-36581300-37024649
فیکس: 042-36581400
موبائل 0321-0300-8448699
AL HAMRA

WEDDING HIGH POINTS

Designers take footwear to new heights at *EBH* with diamantes & exclusive embellishment covering the feet. *ELEGANT* and *EXPRESSIVE*. Let it become the *HIGH POINT* at your weddings.

ENGLISH BOOT HOUSE (Pvt) Ltd.
Karachi

www.ebhshop.com

ebh 12